ماہنامہ

ترجمان القرآن

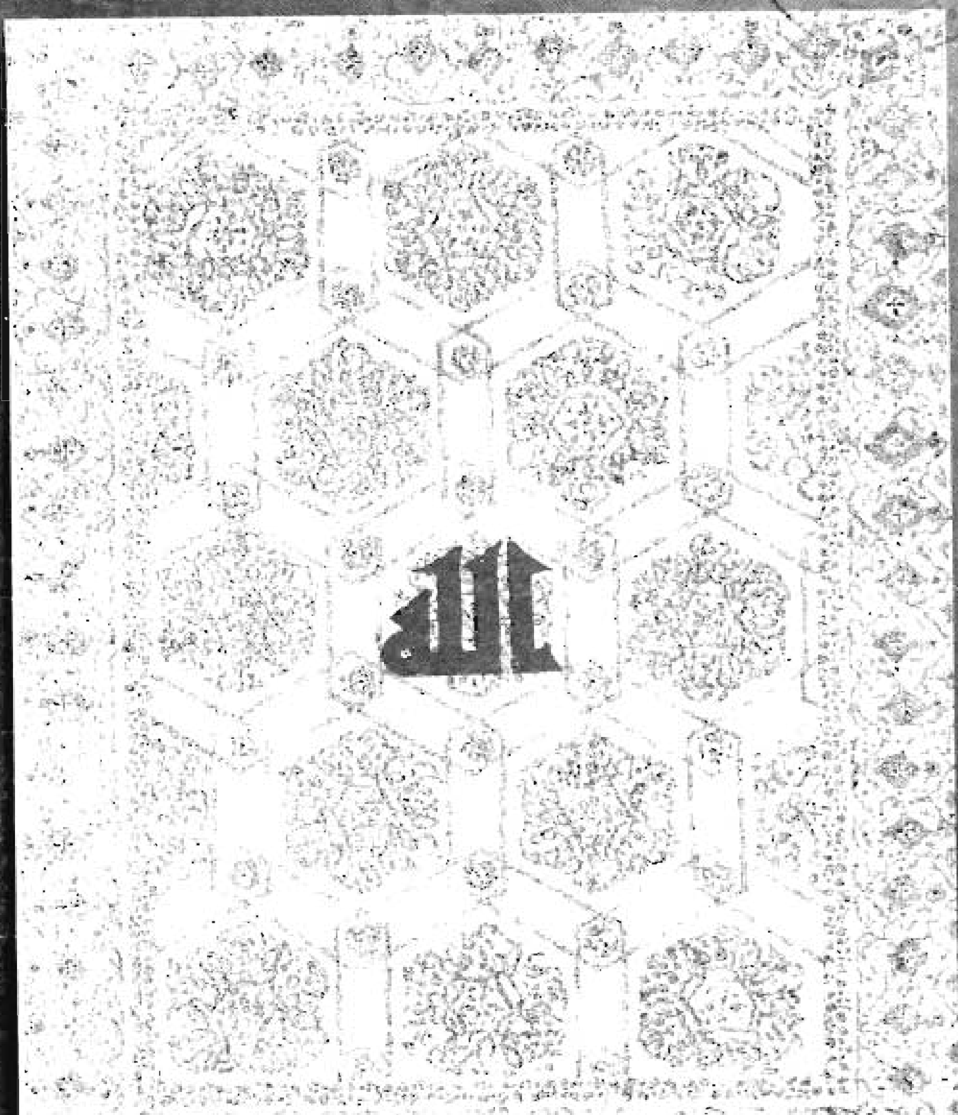
جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

جنوری ۱۹۹۷

مدیر

خرم مراد



ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

اعزازی

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۳ — جنوری ۱۹۹۷ء، رمضان ۱۴۱۷ — عدد ۱

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۸۴۴۶۰۵

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۲ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ -/۱۵ روپے

زر سالانہ -/۱۵۰ روپے

مشرق وسطی -/۵۵۰ روپے

بنگلہ دیش، مسقط -/۴۵۰ روپے

بھارت -/۳۰۰ روپے

یورپ، مشرق بعید -/۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

خرم بھائی اپنے رب سے جا ملے!

ترجمان القرآن کے مدیر، محترم خرم مراد کا ۱۹ دسمبر ۹۶ کو لسٹر میں دل کا تیسرا بائی پاس آپریشن کیا گیا۔ آپریشن کے بعد حرکت قلب بحال نہ ہو سکی اور وہ اپنے رب سے جا ملے۔ بلاشبہ ہم سب کو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اس موقع پر محترم **قاضی حسین احمد** کے تاثرات:

خرم مراد صاحب دل دردمند رکھتے تھے۔ اس کو ہر طرف سے چرکے لگتے رہتے تھے اور یہ امت مسلمہ کے ہر دکھ درد کو شدت سے محسوس کرنے والا دل تھا۔ لیکن اتنے زخم سہنے کے باوجود یہ دل دل زندہ تھا، زندہ رہنا چاہتا تھا اور اپنا درد امت کے ایک ایک فرد میں بانٹنا چاہتا تھا۔ یہ دل آخری دم تک تڑپتا رہا اور اپنی تڑپ اپنے قافلے میں بانٹتا رہا۔ حقیقی معنوں میں یہ زندہ دل بالآخر اس دنیائے فانی سے اپنے رب کی طرف انتقال کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خرم مراد بھائی اللہ والے تھے۔ ہر وقت اللہ سے لو لگائے رکھتے تھے۔ ایک ایک ثانیہ اس کی بندگی میں گزارنے کا عزم لیے ہوئے تھے۔ بیماری کے عالم میں جتنی محنت اور لگن سے انھوں نے کام کیا، ہم میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔ انھیں وقت کی تنگی اور کام کی وسعت کا شدت سے احساس تھا۔ وہ اپنے لیے توشہ آخرت جمع کرنے کے شوق میں دنیا و مافیہا سے مستغنی تھے۔

ماہنامہ ترجمان القرآن کو انھوں نے مولانا مودودیؒ کے بعد دوبارہ ایک نئی آن بان دی ہے۔ اس کو دینی اور علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا، تحریک اسلامی کے کارکنوں کو اس سے دوبارہ وہی راہنمائی حاصل ہونے لگی جو کبھی مولانا مودودیؒ کے دور ادارت میں حاصل تھی۔

خرم مراد انجینئرنگ کے طالب علم تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ رہے، اس کے ناظم اعلیٰ بنے۔ وہ ناظمین اعلیٰ کے گروہ میں علمی و دینی مرتبے اور اخلاص و للہیت میں ممتاز تھے۔ نوجوان نسل اور طلبہ میں دینی اور تحریکی شعور پیدا کرنے اور انھیں اعلائے کلمتہ اللہ کے راستے میں سرگرم سفر رکھنے میں ان کی دلچسپی زندگی کے آخری لمحوں تک قائم رہی۔ ایک ممتاز اور ماہر انجینئرنگ کنسلٹنٹ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ دین کی اشاعت اور خدمت کے لیے وقف رکھا۔ پاکستان کے سیاسی حالات میں پوری دلچسپی لیتے رہے۔

خرم بھائی نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ بندگی رب میں گزارا، اعمال صالحہ کا ایک گرانقدر خزانہ اپنے لیے آگے بھیجا اور ایک گراں بہا علمی اور دینی ورثہ اپنے پیچھے چھوڑ کر رخصت ہوئے۔ ان کی صالح اولاد بھی تحریک اسلامی کا ورثہ ہے اور ان کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ ترجمان القرآن کا بیشتر کام ان کی زندگی میں ان کے محنتی اور مخلص بھائی مسلم سجاد صاحب نے سنبھال لیا تھا۔ ان کے صاحبزادے حسن صہیب جماعت کی مرکزی ٹیم کا ایک حصہ ہیں۔ احمد عمر امریکہ میں اور فاروق مراد برطانیہ میں دعوتی محاذ پر سرگرم عمل ہیں۔ ان کا وہ بیٹا اویس جو سننے بولنے سے معذور ہے، تحریک اسلامی کا سرگرم کارکن ہے اور اپنے حلقے میں دعوت دین کا کام کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی برکات ان کے اہل خانہ اور تحریک اسلامی پر قائم رکھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ ایک صابرہ و شاکرہ اور اولوالعزم خاتون ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ اپنی اولاد پر [illegible] قائم رکھے۔ یہ خرم بھائی کے اخلاص کا نتیجہ ہے کہ ان کے گھر کا ہر فرد خدمت دین میں لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ (آمین)

رفتید ولے نہ از دل ما

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

کل کا روشن مستقبل اور آج کے سلگتے مسائل

خرم مراد

اس بات میں کسی شک کی گنجایش نہیں کہ "آج" کا دامن اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک یقینی روشن مستقبل کے بھرپور امکانات سے لبریز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ آج کل جو حوادث و واقعات پیش آ رہے ہیں وہ مایوسی پیدا کرتے ہیں' ناکامی و مغلوبیت اور پس ماندگی کی خبر دیتے لگتے ہیں۔ اپنا افتراق و انتشار اور نزاع و اختلاف اور اس کے تباہ کن نتائج دیکھ کر دل بیٹھنے لگتے ہیں۔ اغیار کی سیاسی' فوجی اور ابلاغی قوت و بالادستی اور ان کے مکر و فن کی کامیابی دیکھ کر حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود' ہمارے اس یقین میں کوئی کمی نہیں آتی کہ کل سورج طلوع ہو گا تو عزت و سربلندی اور ترقی کی خوش خبری لے کر آئے گا۔

آج اور کل کے واقعات سے نگاہ اوپر اٹھا کر آج کی اور ۱۹۴۷ کی دنیا پر ایک نظر ڈالیے' تو آپ کو صحیح اندازہ ہو گا کہ اس نصف صدی میں ہم نے اپنی منزل کی طرف کتنی نمایاں پیش رفت کر لی ہے۔ اسلام ایک مذہب کے مقام سے سفر کر کے مقصدِ حیات بن گیا ہے۔ وہ مستقبل کی اجتماعیت' ریاست اور تہذیب کے نقشہ گر کے مقام پر پہنچ گیا ہے۔ نسلوں کی نسلوں نے اپنی سعی و جہد' اور اپنی آرزو و جستجو کو اس مقصد کے حصول اور اس نقشۂ فردا پر مرکوز کر دیا ہے۔ ملت کے جسم میں احیاے اسلام کے ساتھ وابستگی کی ایک رو دوڑ گئی ہے اور حوصلہ شکن حالات اور ناکامیوں کے باوجود یہ وابستگی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ابلیس نے جس کو فتنہ فردا قرار دیا تھا وہ اس کے عالم پیر کے لیے فتنہ امروز بن کر نمودار ہو گیا ہے۔

یہ روشن مستقبل کب طلوع ہو گا؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ اس کا علم اس کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے' جس کے پاس غیب کی ساری کنجیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے نصرت و فتح کا قطعی وعدہ ضرور فرمایا: اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۔ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ 'یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب رہے

گا۔ (الصّٰفٰت ۳۷: ۱۷۱-۱۷۳) لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا: "اے نبیؐ، صبر کرو، اللہ کا وعدہ برحق ہے۔ اب خواہ ہم تمھارے سامنے ہی ان کو ان برے نتائج کا کوئی حصہ دکھا دیں جن سے ہم انھیں ڈرا رہے ہیں، یا (اس سے پہلے) تمھیں دنیا سے اٹھا لیں"۔ (المومن ۴۰: ۷۷) ہمارے ساتھ بھی اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اور لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ کے وعدے ضرور پورے ہو کر رہیں گے، خواہ ہماری آنکھیں کامرانی کا یہ منظر نہ دیکھ سکیں۔

جو بات ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ روشن مستقبل کے حصول کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ ہے جدوجہد کا راستہ، انفاق اور جہاد فی سبیل اللہ کا راستہ۔ نصرت الٰہی کے بغیر تو ایک قدم بھی نہیں اٹھ سکتا، کجا کہ منزل سر ہو جائے۔ اِنۡ یَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ، اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں، (آل عمران ۳: ۱۶۰)، لیکن یہ نصرت الٰہی صرف انھی کو حاصل ہوتی ہے جو جدوجہد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ يَنۡصُرۡكُمۡ وَيُثَبِّتۡ اَقۡدَامَكُمۡ، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا، اور تمھارے قدم مضبوط جما دے گا۔ (محمد ۴۷: ۷)۔ جس سچے ایمان کے ساتھ سربلندی کا وعدہ مشروط ہے، اس کی صداقت کی کسوٹی بھی جدوجہد ہی ہے۔ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ لَمۡ يَرۡتَابُوۡا وَجٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ، حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔ (الحجرات ۴۹: ۱۵)

جدوجہد کے کئی پہلو ہیں: خود اپنے اندر جدوجہد کی استعداد پیدا کرنا، اور اپنی شخصیت کو جدوجہد کے لائق بنانا۔ انسانوں کی مطلوب ضروری تعداد کو جدوجہد کے لیے کھڑا کرنا، ان کو ایک قوت بنانا، ان کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں اور بہتر سے بہتر اور موثر سے موثر تر طریقہ اور تدابیر سے جدوجہد میں لگانا۔ ماحول، معاشرہ، انسان اور نظام، جیسے کچھ ہیں، ان ہی کے درمیان اپنے لیے پیش رفت اور منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ بنانا۔ اس مقصد کے لیے راہ کے امکانات و خطرات کا، موافق و مخالف عوامل اور قوتوں کا، حال اور مستقبل کا زیادہ سے زیادہ ممکن صحیح اندازہ کرنا۔ ایسی حکمت عملی اختیار کرنا جس سے منزل مطلوب تک پہنچنا ممکن نظر آئے۔ اپنے اعمال و اقدامات کا جائزہ و احتساب اور اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر استغفار کی روش پر کاربند رہنا۔ وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِىۡۤ اَمۡرِنَا وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ، ان کی دعا بس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو، اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر"۔ (آل عمران ۳: ۱۴۷) یہاں تک کہ فتح و نصرت دیکھ کر بھی یہی روش رہے: فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ، اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو، (النصر ۱۱۰: ۳)

صرف تمنا اور خواہش سے مستقبل کی نقشہ گری نہیں ہو سکتی۔ دعائیں بھی جدوجہد کا بدل نہیں بن سکتیں۔ جدوجہد کے علاوہ کسی اور ذریعے سے اللہ کی نصرت اور فتح حاصل نہیں ہو سکتی۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ بڑی سے بڑی جدوجہد سے بھی اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ کوئی انسانی تدبیر بھی کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ کوئی انسانی عقل بھی ان تمام عوامل و حالات کا احاطہ نہیں کر سکتی جو جدوجہد کی کامیابی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ کسی انسان کے بارے میں یہ ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ اس سے خامی، کوتاہی، غلطی یا گناہ کا صدور نہ ہو گا۔ کوئی ایسا نسخہ تربیت موجود نہیں جو ایسے کامل انسان پیدا کر سکے جن کے بارے میں ایسی ضمانت دی جا سکے۔ چنانچہ جتنی خام، ضعیف اور کم معیار عقل، استعداد، ایمان اور عمل صالح میسر آئے، اور جتنی بھی بری بھلی جدوجہد بن پڑے، وہ راہ خدا میں پیش کر دینا چاہیے۔ ہر صورت میں حکم اور تدبیر کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اور نتائج صرف مشیت الٰہی پر منحصر ہیں۔ لیکن جہاں تک انسان کی نگاہ اور عقل کام کرے، وہاں تک یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ جدوجہد کی کامیابی کے لیے ضروری شرائط زیادہ سے زیادہ پوری ہوں۔ آج اس موضوع کو سمیٹ کر ہم چند اہم اور بنیادی باتیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر ان قوتوں اور تحریکات کی توجہ کے لیے جنھوں نے اس صدی میں غلبہ دین کی لہر پیدا کی ہے۔

۱۔ سب سے ضروری اور اہم شرط للہیت اور اخلاص ہے۔ پوری جدوجہد، اور جدوجہد کا ہر کام اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا چاہیے، اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے۔ رضائے الٰہی کی جستجو، جنت کی تمنا و طلب اور اس کے لیے بھاگ دوڑ اور مسابقت اسی للہیت ہی کی تعبیر ہے۔ قرآن میں جہاں بندگی کی دعوت ہے، وہاں مُخلِصِین کی شرط لگی ہوئی ہے، اکثر مقامات پر وَجهِ رَبِّهِ الاعلیٰ اور مَرضَاتِ اللّٰہ کی جستجو کی تاکید ہے، اور جہاں جدوجہد کا ذکر ہے، وہاں جنت کو مطلوب و محبوب بنانے کی دعوت ہے۔ قرآن اس دعوت سے بھرا ہوا ہے۔

آج غلبہ دین کی جدوجہد کو جو بڑے بڑے مسائل درپیش ہیں، ان کی بڑی وجہ ہمارے نزدیک اسی مطلوب اخلاص اور للہیت میں کمی یا کمزوری ہے۔ یہ افراد کی سستی اور بے رغبتی ہو، تحریکوں میں جمود ہو، دنیا طلبی کا غلبہ ہو، عہدوں اور جاہ و عزت کی طمع ہو، خود رائی و خود سری ہو، نظم و ضبط کی کمی ہو، باہمی افتراق و تنازعات ہوں، دعوت الی اللہ سے لاپروائی اور دعوت کی بے اثری ہو --- جو بھی ہو، کھنگال کر دیکھیے تو تہہ میں یہی مرض ملے گا۔ سب سے بڑا سلگتا مسئلہ یہی اخلاص و للہیت میں کمی کا مسئلہ ہے۔

للہیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ ہر فرد کا اپنا معاملہ ہے۔ وہی اپنے اندر للہیت پیدا کر سکتا ہے، وہی جدوجہد کو للہیت کے رنگ میں رنگ سکتا ہے، وہی اس کے ہونے یا نہ ہونے کے لیے ذمے دار اور جواب

وہ ہے' اور اگر یہ نہ ہو تو نقصان بھی سراسر اسی کا ہے۔ یہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان معاملہ ہے اور وہ جو عَلِیم بذات الصدور ہے۔ وہی صحیح علم رکھتا ہے اور فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس میں کتنی للٰہیت ہے۔ اجتماعی جدوجہد میں تو ہر طرح کے لوگ شامل ہونا چاہییں' اور ہوں گے: وہ بھی جن کے دل اخلاص کی اس نعمت سے خالی ہوں' وہ بھی جن کے دل اس سے مالا مال ہوں۔ کوئی اجتماعیت ہر فرد کے اندر للٰہیت پیدا کرنے کی ذمہ داری نہیں لے سکتی' نہ اسے فرد کے اخلاص کو جدوجہد میں شرکت کے لیے شرط بنانا چاہیے۔

لیکن دوسری طرف اجتماعیت کو تین باتوں کا اہتمام پوری شدت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ وہ تذکیرو موعظت اور دعوت کے تمام ممکن اور رائج طریقوں سے لوگوں کو مسلسل اور تاکید کے ساتھ للٰہیت کی طرف راغب کرتی رہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اجتماعی ماحول اور کلچر کو للٰہیت کے رنگ میں رنگنے کا اہتمام کرے۔ جو اس ماحول میں سانس لے' اس پر یہ رنگ چڑھے۔ وہ رضائے الٰہی اور جنت کی قدر و قیمت اور مطلوبیت کا خریدار بن جائے۔ تیسرے یہ کہ اجتماعیت اپنی پالیسیوں اور اقدامات کے بارے میں فیصلے کرتے ہوئے لازماً دنیا میں ان کے نتائج کو سامنے رکھے' لیکن مجموعی طور پر نیت اور محرک صرف اللہ اور جنت کو رکھے' اور کوشش کرے کہ کوئی ایسا قدم تو ہرگز نہ اٹھائے جو اللہ کو ناپسند ہو' مثلاً: تدابیر وہ ضرور اختیار کی جائیں جن کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک سفر ہوں' لیکن نیت ان کی اور اپنی اخروی فلاح ہی رہے۔

ہمیں یقین ہے کہ جس قدر اخلاص بڑھے گا' للٰہیت رچے گی اور بسے گی' اس کا رنگ زندگی پر چھائے گا' اس قدر ہمارے مسائل حل ہوں گے' ہماری کمزوریاں اور خرابیاں دور ہوں گی' ہمارے اندر مضبوطی اور شوق و طلب میں اضافہ ہو گا' اور ہم نصرت الٰہی کے مستحق بنیں گے۔

۲۔ دوسری اہم اور ضروری شرط ہے' زیادہ سے زیادہ انسانوں کو --- ہر طرح' ہر معیار اور ہر انداز کے انسانوں کو --- دینی جدوجہد کے دائرے میں جمع کرنا' اور ان کی جو بھی استعداد و صلاحیت ہو اسے دین کے کام میں لگا دینا۔ للٰہیت اگر روح و مقصود و بنیاد ہے' تو انسان دینی جدوجہد کا مرکز و محور ہے۔

ہمارے نزدیک دینی جدوجہد کا دوسرا بڑا سلگتا مسئلہ یہی ہے کہ اس جدوجہد میں انسان کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو ہونا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک عام انسان تک' ہر طرح کے انسان تک پہنچنے' اس کے دل میں گھر کرنے' اسے اپنا ہم نوا بنانے' اسے اپنے دائرے میں جمع کرنے' اسے اپنے ساتھ لے کر چلنے' اور اس کی استعداد و صلاحیت کو ضیاع سے بچا کر دین کے لیے کارگر بنانے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

بے شمار ممالک ہیں جہاں منظم دینی گروہ موجود ہیں' ان کے پاس قوت و طاقت بھی ہے' صلاحیت' نیکی اور تقویٰ بھی موجود ہے' لیکن عام معاشرہ ان کے ساتھ نہیں۔ کوئی موثر عوامی مزاحمت کی لہر نہیں اٹھتی'

حالانکہ حکومتیں ہزاروں کو ذبح کر دیتی ہیں، مثلاً شام میں، ہزاروں کو جیلوں میں بند کر کے تعذیب کا شکار بناتی ہیں، مصر میں، انتخابی عمل کو من مانے طریقے سے اپنی مرضی کے نتائج نکالنے کے لیے استعمال کرتی ہیں، انڈونیشیا اور مصر میں، آزادانہ انتخابات ہوتے ہیں مگر بھاری اکثریت غلبہ دین کے حامیوں کے حق میں ووٹ دینے کو تیار نہیں، پاکستان اور ترکی میں، جہاں ظلم و جبر کے خلاف ہتھیار اٹھائے گئے ہیں اور تشدد کا راستہ اختیار کیا گیا ہے وہاں بھی عام آبادی نے ساتھ نہیں دیا ہے، الجزائر میں جتنی زبردست اور جتنی طویل مسلح جدوجہد برپا رہی، اس پیمانے پر کوئی عوامی مزاحمت کی تحریک ہوتی جس میں معاشرے کا بڑا حصہ شامل ہوتا، تو کیا کوئی حکومت ٹک سکتی تھی۔ اس دائرے میں مطلوب کامیابی کیسے حاصل ہو؟ عام معاشرے کو کیسے اپنا ہم نوا اور ہم رکاب بنایا جائے؟ یہی آج کا دوسرا بڑا چیلنج ہے۔

اس سلگتے مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے کئی پہلوؤں سے غور و فکر اور اقدامات کی ضرورت ہے۔ دینی جدوجہد میں انسان کی قدر و قیمت، اس کی ضرورت اور اس کا مقام جاننے اور تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔ دین کا، اس کے پیغام اور جدوجہد کا مخاطب ہر عام انسان ہے، امت مسلمہ عام انسانوں کے لیے (اُخرجت للناس) برپا کی گئی ہے۔ دینی جدوجہد کا مقصود ہر انسان کی اخروی اور دنیوی فلاح ہے۔ دین کی دعوت اور جدوجہد انسانوں کے ذریعے ہی انجام پا سکتی ہے، دینی نظام انسانی ہاتھوں ہی سے چلے گا، انسانوں ہی پر قائم ہو گا، انھی کی فلاح و بہبود کے لیے قائم ہو گا۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو ہر وہ انسان قیمتی ہے جو دینی مقاصد کا کوئی حصہ بھی قبول کرے، جو دینی جدوجہد میں کسی درجے میں بھی شرکت کرنے کو تیار ہو۔ ہر انسان کو اپنا بنا لینا اور اپنے ساتھ لے کر چلنا، یہ ہر دینی جدوجہد کرنے والے کا فرض ہے۔ بلکہ وہ انسان بھی قیمتی ہیں، جو دینی مقاصد کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، مگر گوناگوں معاشرتی و سیاسی وجوہات کی بنا پر ان کی حمایت حاصل ہو سکتی ہے، حاصل کرنا چاہیے، اور وہ ضروری و مفید ہو سکتی ہے۔ جیسے ابو طالب یا وہ سرداران قریش جو قرابت یا شرافت نفس کی وجہ سے مظلوم و مقہور مسلمانوں کو حفاظت و پناہ فراہم کرتے تھے۔ بلکہ وہ انسان بھی قیمتی ہیں جو سخت دشمن ہوں، لیکن جن کے ساتھ آ جانے سے معاشرے میں وزن کا پلڑا جھک سکتا ہو۔ جیسے ابو جہل اور عمر بن الخطابؓ جن کے لیے خود حضورؐ نے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے اسلام کی تقویت کا سامان کرے۔

یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ انسان اپنی صلاحیت و استعداد کے لحاظ سے، اپنے ایمان و تقویٰ کے لحاظ سے اور اپنے کردار کے لحاظ سے اعلیٰ بھی ہوں گے اور ادنیٰ بھی۔ لیکن اندھا بھی ہو تو وہ توجہ اور مقام کا مستحق ہے۔ میدان جنگ سے پلٹ آنے والے ہوں، تو وہ بھی عفو و استغفار اور اجتماعی معاملات میں شریک رکھے جانے کے مستحق ہیں۔ عبداللہ بن ابی جیسے دشمن منافق کے ساتھ بھی اس حد تک نرم برتاؤ کیا گیا کہ "لوگ یہ نہ کہیں کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں"۔

ایک بگڑے ہوئے مسلمان معاشرے میں یقیناً وابستگی و وفاداری اور ایمان و عمل کے لحاظ سے معیاری لوگوں کی تلاش بھی ہوگی، ایسے لوگ جمع کرنے اور بنانے کی خصوصی فکر بھی ہوگی، اور ابتدائی مراحل میں تو زیادہ اہتمام سے ہوگی، لیکن جیسے ہی انسانوں کی قوت استعمال کر کے غلبہ دین کی جدوجہد شروع ہوگی--- سیاسی ہو، معاشرتی، یا عسکری--- ویسے ہی ہر مسلمان کو، وہ کیسا ہی مسلمان ہو، اپنے ساتھ شامل کرنا اور اپنے ساتھ لے کر چلنا ضروری ہوگا۔ بنی اسرائیل کے جن "مسلمانوں" کو اپنے ساتھ لے کر حضرت موسیٰؑ مصر سے نکلے تھے، ذرا قرآن اور تورات میں ان کی ایمانی، اعتقادی، اخلاقی، عملی اور دینی حالت دیکھیے، تو آپ کو ہماری اس بات کی اہمیت کا صحیح ادراک ہوگا۔

ایک دفعہ انسان کا یہ مقام سمجھ لیا جائے تو رویوں، پالیسیوں اور نظام میں بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت خود بہ خود محسوس ہوگی، تبدیلیاں خود بہ خود پیدا ہوں گی۔ پھر ہر شخص جس کا ساتھ دینا ضروری ہو، یا جو ساتھ دینے کے لیے تیار ہو، اس کے لیے دل کے دروازے بھی کھل جائیں گے اور دائرہ اجتماعیت کے دروازے بھی۔ اجتماعی نظام جو تحریکوں نے اختیار کیے ہوئے ہیں نصوص پر مبنی نہیں، اجتہاد پر مبنی ہیں۔ ان کو وضع کرنے میں ہمارے سامنے عصر حاضر کی نظریاتی تحریکوں کے نظام کے ماڈل بھی رہے ہیں۔ لیکن ہماری روایات میں اور بھی ماڈل موجود ہیں، اور آج کے دور میں اور بھی ماڈل رائج ہیں، اور نصوص کی روشنی میں استنباط و اجتہاد کے ذریعے ہم کو ایسے ماڈل وضع کرنا چاہییں جو ان تمام انسانوں کو مساوی شرکت کا بھرپور احساس دے سکیں جو اس غلبہ دین کی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔ لوگوں کو چھانٹ چھانٹ کر لینے، اور صرف معیاری لوگوں کو لینے سے ہی وہ قلیل گروہ تیار ہوئے جو قلیل ہونے کے باوجود قوی اور موثر ہیں۔ لیکن اس طریقے سے تحدید و تفریق بھی پیدا ہوئی۔ جس سے معاشرہ بحیثیت مجموعی اس قلیل گروہ کی پشت پناہی کے لیے تیار نہ ہو سکا۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس پورے مسئلے کا ازسرنو جائزہ لے کر ہم مناسب دور رس اقدامات کریں جو عام انسانوں کو اپنے دائرے میں جمع کرنے میں مدد و معاون ہوں۔

اس سلسلے میں یہ غلط فہمی بھی دل سے نکال دینا چاہیے کہ تعداد فی نفسہ مطلوب نہیں، تعداد کی طلب اور جستجو مستحسن نہیں، تعداد و توسیع اور معیار و استحکام میں کوئی بنیادی و منطقی تضاد ہے۔ اصل چیز تو معیار ہے، تعداد سے کیا ہوتا ہے۔ اس موضوع پر کسی تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں، لیکن یہ بات تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نصرت و فتح کی علامت "یدخلون فی دین اللہ افواجا" کو قرار دیا ہے، اپنی امت کی تعداد کو حضورؐ نے اپنے لیے باعث فخر قرار دیا ہے، اور اس تعداد میں اضافے کے لیے حضورؐ رات دن کوشاں رہے ہیں۔ اور اگر دینی جدوجہد میں شریک ہونا ہی نار جہنم سے نجات اور جنت میں داخلے کا سب سے یقینی راستہ ہے، تو اس راستے کو کسی کے لیے بند کیوں کر کیا جا سکتا ہے، یا کسی کو انتظار و تعویق میں کیوں کر ڈالا جا سکتا ہے۔

یہ بات واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ ایسی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ محض انسان کو مرکز بنانے،

اس کا مقام تسلیم کرنے' ہر طرح کے انسان کے لیے دل اور اجتماعیت کے دروازے کھول دینے سے' ایک عام معاشرہ بڑی تعداد میں کسی نہ کسی طرح دینی جدوجہد میں شامل ہو جائے گا۔ اس مقصد کے لیے ایسے انداز و اسلوب میں وہ دعوت بھی ضروری ہے جو دلوں کو مسخر کر سکے' اور وہ قیادت بھی جو دلوں کو جیت لے۔ اس کے بعد بھی ماحول' حالات اور مشیت الٰہی پر کامیابی کا انحصار ہو گا۔

لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر ایک دفعہ ہم نے اس بات کو سمجھ لیا کہ معاشرہ اور انسان کیسے ہی بگڑے ہوئے ہوں' اسی معاشرے اور انھی انسانوں میں سے وہ قوت پیدا کرنا ہے' اور وہ پیدا ہو سکتی ہے' جو اصلاح و تبدیلی اور غلبہ و سربلندی کا کام کر سکے۔ اللہ کی نصرت کے بعد' کامیابی کا راز انسانی قوت میں پوشیدہ ہے' نہ کہ مال و اسباب اور اسلحہ و سامان میں۔ هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ' وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمھاری تائید کی۔ (الانفال ۸:۶۲)' اور يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ' اے نبیؐ تمھارے لیے اور تمھارے پیرو اہل ایمان کے لیے تو بس اللہ ہی کافی ہے۔ (الانفال ۸:۶۴)

یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مومنین کی اس جماعت میں لوگوں کے مقام اور درجات کا تعین اللہ کے لیے ان کی وفاداری و قربانی سے ہوا کرتا تھا۔ ایمان' عمل صالح اور تقویٰ تو وہ چیزیں ہیں جن کا صحیح علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ چنانچہ مہاجرین' انصار' اصحاب بدر' اصحاب بیت الرضوان وغیرہ وہ معیار تھے جن پر لوگوں کو مقام دیا جاتا تھا۔ رہے حکومتی اور فوجی مناصب' تو ایسے لوگوں کو ترجیح دی جاتی تھی جو' ایمان اور وفاداری کے ساتھ ساتھ' ان مناصب کو کامیابی کے ساتھ سنبھالنے کی زیادہ صلاحیت اور اہلیت رکھتے تھے۔ اس کے بے شمار نظائر موجود ہیں۔

ان دو بڑے مسائل کے بعد ہم بقیہ اہم مسائل پر مختصر گفتگو کریں گے:

۳۔ ایک بڑا مسئلہ حسن اخلاق کا ہے۔ لوگوں کے دل جیتنے' ان کو ساتھ لانے' جوڑے رکھنے' اور ساتھ چلانے کے لیے سب سے موثر قوت حسن اخلاق کی قوت ہے۔ یہ حسن اخلاق' رافت و رحمت' نرمی و فیاضی' عفو و درگزر اور اکرام و احسان سے عبارت ہے۔ اصل کارگر اور موثر قوت نہ نظریے میں ہے' نہ کتاب میں' نہ کلام میں' نہ تحریر و تقریر میں' نہ ڈپلومیسی اور پبلک ریلیشن میں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آج کے دینی جدوجہد کرنے والوں کے اخلاق کو نبی کریمؐ کے خلق عظیم سے وہ کم سے کم نسبت حاصل نہیں ہوئی ہے جو مطلوب اور ضروری ہے' اور قابل حصول ہے۔ یہ حضورؐ کا اخلاقِ کریمانہ تھا' جس کی مدح قرآن میں ہے اور جس کی تصویر سیرت میں دیکھی جا سکتی ہے' جس نے مقناطیس کی طرح لوگوں کو چمٹا لیا' اور چمٹائے رکھا۔ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ' تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ

اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ (آل عمران ۳:۱۵۹)' اور حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ' تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے' ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔ (التوبہ ۹:۱۲۸)

اس کمی کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے: افغانستان میں اتنے طویل عرصے تک جہاد جاری رہا' کامیابیاں اور فتوحات حاصل ہوئیں' لیکن مجاہدین نہ باہم الفت و اعتماد کے رشتے میں جڑ سکے' نہ یہ دیکھنے میں آیا کہ مخالفین میں سے لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر آئے ہوں اور مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گئے ہوں۔ جن کمیونسٹ جرنیلوں نے کسی گروہ کا ساتھ دیا' تو وہ صرف اپنے مفادات کی خاطر۔ پاکستان میں آپ گھوم پھر کر دیکھ لیجیے ' شاذ ہی ایسے لوگوں سے ملاقات ہو گی جو مخالف کیمپ سے ٹوٹ کر آئے ہوں اور اب دین کے غلبے کو مقصد زندگی بنا لیا ہو۔ طالبان کا گروہ خالص قیام شریعت کا دعوے دار ہے۔ ایک طرف طائف کا سفر دیکھیے اور ثقیف کے وفد کا خیر مقدم' سرداران قریش کے مظالم دیکھیے اور لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کی صدا' اور دوسری طرف اس نجیب اللہ کو پھانسی کے تختے پر لٹکا کر اپنے جوش انتقام اور حمیت دین کی تسکین کا سامان کرنا دیکھیے' جو اقوام متحدہ کی پناہ میں تھا' نہتا اور غیر مسلم تھا! حالانکہ مشرک بھی امان طلب کرے تو اسے مامن تک پہنچانے کا حکم ہے۔

صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم سے کم سے کم نسبت کے حصول کے بغیر انسان جمع نہ ہوں گے' مخالفین کے دل مسخر نہ ہوں گے' اسلام کے غلبے کے لیے قوت فراہم نہ ہو گی' اور نتیجتاً دین کا قیام ایک امر محال ہو گا۔ خواہ ہمارے پاس اسلحہ کے ڈھیر ہوں' سیاسی اقتدار بھی ہو' دلائل و براہین کا انبار بھی ہو۔

۴۔ چوتھا مسئلہ اختلافات کا افتراق و نزاع بن کر وحدت اور شیرازہ بندی کو غیر معمولی نقصان پہنچانے کا مسئلہ ہے' اور اختلافات کے باوجود متحد رہنے' ساتھ مل کر کام کرنے اور دینی قوتوں کو متحد رکھنے کا مسئلہ ہے۔ جہاں انسان جمع ہوں گے' وہاں اختلافات لازماً ہوں گے۔ رائے کے اختلافات بھی ہوں گے' مزاج کے بھی' مفادات کے بھی۔ ان اختلافات سے کوئی مفر نہیں۔ دور صحابہؓ میں بھی نہیں تھا۔ سقیفہ بنی ساعدہ سے لے کر جنگ جمل و صفین تک کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔

اختلافات سے بچنا ممکن نہیں' لیکن اختلافات کو افتراق' تنازع اور مخاصمت بننے سے روکنا ممکن ہے۔ لا تفرقوا اور لا تنازعوا ہی کی تاکید قرآن مجید نے فرمائی ہے۔ لیکن اس پہلو سے بھی مسلمان بہ حیثیت مجموعی' اور دینی جدوجہد کرنے والے' خاص طور پر' جن کمزوریوں کا شکار ہیں وہ عیاں ہیں۔

اختلافات کے باوجود بڑے اور عزیز تر مقاصد کی خاطر متحد رہنے کے لیے سب سے بڑھ کر اخلاص و نیت اور نفس پر ضبط و قابو درکار ہے۔ اس کی یقیناً کمی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مناسب تعلیم و تربیت بھی ضروری ہے تاکہ لوگوں کو اجتماعی زندگی میں اختلافات کا مقام معلوم ہو' اختلاف کی حدود و آداب

سے واقفیت ہو' ان آداب و حدود کی پابندی کی استعداد پیدا ہو۔ جھٹ حلال و حرام اور حق و باطل اور کفرو اسلام کے فتوے جاری کرنے کے طریقے کو ترک کرنے کی ضرورت ہے۔ تدبیری امور ہوں یا اجتہادی مسائل' اپنی رائے کو حتمی اور آخری سمجھنے کی خود سری پر قابو پانا ضروری ہے۔ اعجاب المرء برایہ (اپنی رائے کو سب سے بہتر سمجھنا) ہلاکت کا سامان ہے۔ ہر اختلاف کو حق و باطل کا مسئلہ بنا لینے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ اپنی رائے کو صحیح سمجھنے کے باوجود اس کے غلط ہونے کے احتمال' اور دوسری رائے کو غلط سمجھنے کے باوجود اس کے صحیح ہونے کے احتمال کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔

اختلافات کے حدود و آداب کی پابندی اور اختلاف کے دائرے تک محدود رکھنے کے بغیر' نہ کسی اجتماعی قوت کے مضبوط بننے کا امکان ہے' نہ اس کا امکان کہ وہ معاشرے کے ایک بڑے حصے کو اپنے ساتھ جمع کر لے۔

۵۔ پانچواں مسئلہ' اجتہادی امور اور تدابیر کو نصوص کا درجہ دینے' بنیادی اور اصل مقاصد کے بجائے جزئیات و فروعات پر توجہ اور مساعی کو مرکوز کرنے' اور پھر دینی احکام میں غلو اور تشدد اور بال کی کھال نکالنے پر اصرار کا مسئلہ ہے۔ امت میں تو یہ مرض عام ہے' اور اس کے زوال اور انتشار کا ایک بڑا سبب ہے۔ دینی قوتوں میں بھی اس مرض کا غلبہ صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ سید مودودیؒ نے اپنی ابتدائی تحریروں میں' مثلاً "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" میں بڑے سوز و دردمندی سے' شدت اور اہتمام سے' مضبوط دلائل کے ساتھ' اس مرض کے خلاف جہاد کیا' لیکن اس سے چھٹکارا نہیں ہو سکا ہے۔

اس مرض کی وجہ سے صرف غلو اور تعمق کی بیماریاں ہی نہیں پیدا ہوتیں' جو شاہ ولی اللہؒ صاحب کے بقول دین میں انحراف کا باعث ہیں' افتراق و انتشار میں اضافہ ہی نہیں ہوتا' توجہ اور وسائل انسانی کا ضیاع ہی نہیں ہوتا' بلکہ اصل کام اور اصل مقصد بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے' اور جدوجہد کے لیے کھڑے ہونے والے لوگ ان گلی کوچوں میں اس طرح بھٹک جاتے ہیں کہ بساط زندگی میں ان کے سب مہرے مات کھا جاتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ ابلیس کی زبان سے مسلمان کی بربادی کے لیے یہی نسخہ تجویز کراتے ہیں' تاکہ:

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات[۱] کے ترشے ہوئے لات و منات

۱۔ (اور فقہیات)

ہے وہی شعر و تصوف اُ اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دین کی احتساب کائنات

امام بخاری کی روایت کے مطابق جب ایک مرتبہ مسجد نبویؐ میں لوگ اسی مقام پر نوافل پڑھنے لگے جس مقام پر فرائض پڑھتے تھے، تو حضرت عمرؓ بن الخطاب نے متنبہ فرمایا کہ پچھلی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔ انھوں نے احکام و مطالبات کے درجات میں خلط ملط ہو جانے کے اسی مرض کی نشان دہی کی تھی، اور حضورؐ نے ان کی بات کی تصدیق فرمائی تھی۔

دینی احکام و مطالبات کے ضمن ہی میں نہیں، دیگر اجتماعی امور میں بھی یہ مرض دیکھا جا سکتا ہے۔ چیز کو ذرائع کا مقام --- مثلاً تنظیم، اجتماعات، اپنے طے کردہ وظائف و فرائض اور پروگرام --- وہ خود مقصد بن گئی ہیں۔ تدابیر کا دائرہ تنگ اور محدود ہو گیا ہے، اور ان میں تبدیلی و تغیر انتشار کا باعث بن گیا ہے، اس لیے کہ اپنے اختیارات کو نصوص کا، اور تدابیر کو اصول دین کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اس سلگتے مسئلے کو حل کیے بغیر نہ صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہو گا، نہ ذرائع مطلوبہ نتائج دیں گے، نہ متحد و متفق رہ کر حالات کے تغیر کے ساتھ بمناسب احوال، حکمت عملی اور تدابیر کا اختیار کرنا ممکن ہو گا۔

۶۔ ایک اور سلگتا مسئلہ اتحاد اور یک جہتی کا ہے۔ امت اور معاشرے میں بھی، دینی قوتوں میں بھی، اور مشترک مقاصد کے لیے سیاسی قوتوں میں بھی۔ مسلم معاشرے ہر جگہ مختلف نوعیت کے تفرقوں اور انتشار کا شکار ہیں۔ دینی فرقہ وارانہ اختلافات بھی ہیں، سیاسی اختلافات بھی ہیں، جنھوں نے امت کو باہم نبرد آزما گروہوں میں پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ تصادم اور خون ریزی بھی ہے، ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار بھی نہیں۔ سب سے زیادہ الم ناک بات یہ ہے کہ وہ تحریکات جو غلبہ دین کی جدوجہد کے لیے ہی برپا ہوئی ہیں، وہ بھی یک جان و متحد ہو کر کام کرنے سے قاصر ہیں۔ جیسا ہم نے افغانستان میں دیکھا، جیسا ہم برطانیہ، یورپ اور امریکہ میں دیکھ رہے ہیں۔ جو معاشرے تفرقے اور انتشار کا شکار ہوں، ان کی بڑی تعداد کو کسی دینی مقصد اور دینی قوت کی پشت پناہی کے لیے کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے پہلا ضروری کام تو یہ ہے کہ جہاں تحریکی قوتوں کے متحد و مشترک ہو کر کام کرنے سے نتائج میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا ہے، وہاں عدم اتحاد کے اسباب کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اور مشترک جدوجہد کے لیے نظام اور لائحہ عمل وضع کرنا بھی ضروری ہے۔ جہاں فرقہ وارانہ اختلافات ہیں، ان کو کم کرنے کے لیے تعلیم و تربیت بھی ضروری ہے، اور سیاسی

اُ [اور بحث و نزاع]

تدابیر بھی۔ جہاں سیاسی مقاصد کا حصول پیش نظر ہے' تو سیاسی کشمکش کا' جنگ کی طرح' بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ حلیف بنائے جائیں' کم سے کم لوگوں کو مخالف اور حریف بننے کا موقع دیا جائے' کم سے کم محاذ کھولے جائیں' ایک دشمن کو شکست دینے کے بعد دوسرے دشمن کا رخ کیا جائے: ساتھ مل کر اقدامات کرنے کے دروازے کبھی بند نہ کیے جائیں' عداوت کی آگ کسی طرح نہ بھڑکنے دی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی حکمت عملی اسی اتحاد اور تحلیف کی جستجو اور قیام کی بہترین مثال ہے۔ معاہدہ مدینہ کے ذریعے یہود کو ساتھ ملانا' کافر قبائل سے معاہدے کر کے ان کو حلیف بنانا' یا کم از کم ان کی عداوت کے امکانات و مواقع کو ختم کرنا' دوستوں کو دوست رکھنا' دشمنوں کو دوست بنانے کی ہر ممکن تدبیر کرنا۔

۷ء ساتواں مسئلہ' سیاست ایسی موثر کرنا ہے جو مطلوب نتائج کا پھل دے سکے۔ سیاست بھی ایک ذریعہ ہے' معاشرے میں قوت و طاقت کے سرچشموں میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے' یا انھیں اپنے ہاتھ میں لینے کا۔ باوجود اس کے کہ سیاست کو دینی جدوجہد میں مرکزی مقام دیا گیا ہے' اور ہمارے نزدیک صحیح دیا گیا ہے' اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ بیش تر جگہ سیاست کے نتیجے میں وہ قوت نہیں حاصل ہوئی جو مطلوب تھی۔ اس اہم مسئلے کے بھی کئی پہلو ہیں۔

ایک : اب تک دین و سیاست کی تفریق سے سوچ اور فکر پاک نہیں ہو سکی۔ چنانچہ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ سیاست زیادہ ہو رہی ہے' یا زیادہ سیاسی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ جو کام بھی اللہ کے لیے' اللہ کے حکم کے دائرے میں ہو' وہ خالص دینی کام ہے' خواہ قتال و ملک گیری جیسا سیاسی و دنیوی کام ہو۔ اور جو کام للہیت سے خالی ہو یا احکام الٰہی کی خلاف ورزی پر مبنی ہو' وہ دنیوی اور سیاسی کام ہے' خواہ شہادت اور تعلیم قرآن جیسا بظاہر دینی کام ہو۔

دوسرے : سیاست کا مقصد دینی مقاصد کا حصول ہونا چاہیے' اور جو سیاست ان مقاصد کے لیے ہو وہ دینی سیاست ہے' عبادت ہے۔ لیکن سیاسی تدابیر کو' جو اللہ کی نافرمانی پر مبنی نہ ہوں' احکام دینی کا مقام دینے کی روش صحیح نہیں' مگر یہ روش بھی بہ کثرت پائی جاتی ہے۔ اس طرح دینی قوتوں کا دائرہ عمل بھی محدود ہو جاتا ہے اور دائرہ حمایت بھی۔ تدابیر میں حالات کی مناسبت سے تغیر و تبدل کے بغیر کبھی بھی کامیاب سیاست نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ تغیر و تبدل ناممکن ہو جاتا ہے۔

تیسرے : کامیاب سیاست کے لیے واضح اہداف بھی ضروری ہیں' واقعات اور حالات پر بھی گرفت بھی' مستقبل کے بارے میں صحیح اندازے اور پیش بینی بھی۔ پھر اگر مستقبل کے اندازے صحیح نہ نکلیں تو ان میں ترمیم کر لینا' اور تبدیل شدہ حقائق کے مطابق تدابیر کو ڈھال لینا' یہ بھی ضروری ہے۔ اگر اپنی تدابیر کے نتیجے میں ہم اپنے کو بند گلی میں پائیں' تو اپنے حالات و معاملات کے فہم اور انداز سیاست پر نظرثانی کی ضرورت

ہے۔

چوتھے : معاشرے کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش یقیناً ضروری ہے' لیکن جیسا بھی معاشرہ عمل اور حقیقت کی دنیا میں موجود ہو' اسی معاشرے میں اپنے لیے پیش رفت کا راستہ نکالنا بھی ضروری ہے۔ معاشرہ بھی ان ہی لوگوں کے قابو میں آئے گا' وہی اس پر حکومت کر سکیں گے' جو ایک نظریاتی و مثالی معاشرے کے قیام کے لیے بے سود تلاش و انتظار چھوڑ کر ایک واقعی و حقیقی انسانی معاشرے میں سے اپنے لیے قوت بھی فراہم کر سکیں' اور اس معاشرے کو چلا بھی سکیں۔ جو اپنے سے مختلف لوگوں کو اپنے ساتھ چلانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں' وہ نہ کامیاب سیاست کر سکتے ہیں نہ کامیاب حکومت۔

آخری بات یہ کہ' سیاست صرف حکومتی اور انتخابی سیاست کا نام نہیں۔ حکومت کا اقتدار بھی محدود ہوتا ہے۔ ریاست کے دوسرے اداروں کی طاقت کی وجہ سے بھی' اور معاشرے میں طاقت کے دوسرے سرچشموں کی وجہ سے بھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی سیاست کے دائرے کو حکومت اور انتخابات سے وسیع کر کے اس میں معاشرے اور ریاست کے تمام قوت و طاقت اور اثر و رسوخ کے حامل اداروں کو شامل کریں۔

۸۔ آٹھواں مسئلہ : مغرب کی فوجی' سیاسی' ثقافتی' علمی اور ابلاغی بالاتری اور تسلط کا ہے۔ عالمی قیادت تقریباً تین سو سال سے اہل مغرب کے پاس ہے۔ زبان ان کی ہے' اصطلاحات ان کی ہیں' ادارے ان کے ہیں' قوانین ان کے ہیں' تجارت ان کی ہے' عالمی تجارت پر ان کا کنٹرول ہے' ذرائع ابلاغ ان کے قبضے میں ہیں' اپنی فوجی قوت کو وہ ناقابلِ شکست سمجھتے ہیں۔ لبرلزم' منڈی کی معیشت اور مغربی جمہوریت کی فتح اور عالمی غلبے کو وہ اپنی حتمی فتح قرار دیتے ہیں۔

غلبہ دین کے معنی یہ ہیں کہ قیادت عالم' اہل مغرب کے بجائے اہل اسلام کے ہاتھ میں آئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اتنا عظیم الشان تغیر کیسے واقع ہو گا؟ دینی جدوجہد کرنے والوں نے اس مقصد کے لیے کیا حکمت عملی وضع کی ہے؟ ہمارے نزدیک ہمارے پاس نعرے ہیں' جذبہ ہے' محنت ہے' جدوجہد ہے' لیکن کوئی واضح حکمت عملی نہیں ہے' ہم کسی واضح لائحہ عمل پر کاربند نہیں۔

اس ضمن میں ایک بڑا اہم مسئلہ یہ ہے: کیا یہ تبدیلی قوت کے بل پر آ سکتی ہے؟ مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان نہیں۔ کیا یہ تبدیلی اہل مغرب کے دل و دماغ جیت کر آ سکتی ہے؟ اس مقصد کے لیے ہم کچھ نہیں کر رہے۔ کیا یہ تبدیلی آئے بغیر آج' عالمی معیشت' عالمی مفادات' عالمی عسکری و سیاسی غلبے کے اس دور میں' کیا دنیا کے کسی ایک ملک میں دینی تبدیلی آ سکتی ہے؟ ہمیں اس میں شبہ ہے۔

مشیتِ الٰہی نے نصف صدی میں لاس اینجلز سے لے کر استنبول تک مغرب کی سرزمین میں جو مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیاں پھیلا دی ہیں' ان آبادیوں میں یہ صلاحیت اور امکان موجود ہے کہ وہ مغرب کے ساتھ

کشمکش میں فرنٹ لائن کا کردار ادا کریں۔ کیا ان آبادیوں کو استعمال کرنے کے لیے ہم کوئی حکمت عملی رکھتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ نہیں۔

پھر مغرب نے ہمیں ایک اور اہم مسئلے سے دوچار کر دیا ہے۔ کیا مغرب نے تہذیب و تمدن اور ٹیکنالوجی میں جو ایجادات و اختراعات کی ہیں، جو افکار و خیالات پروان چڑھائے ہیں، جو ادارے اور ذرائع وضع کیے ہیں، وہ سب کفر ہیں، اور مسترد کیے جانے کے قابل؟ یا ان میں ترک و اختیار کی پالیسی اختیار کی جائے گی؟ کیا اسلامی انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ اس تہذیب و تمدن کو جسے مغرب نے تعمیر کیا ہے، ڈھا دیا جائے گا، پھر ملبہ صاف کیا جائے گا، پھر نئے افکار اور اداروں کی دیواریں اٹھائی جائیں گی؟ کیا حقیقت کی دنیا میں یہ عمل کرنے کا کوئی امکان ہے؟ ہمارے خیال میں نہیں ہے۔

مغرب کے ساتھ تہذیبی کشمکش اور اس میں فتح، بہت بڑا مسئلہ ہے۔ صرف نعروں، ہنگاموں اور جذبات کے اظہار سے یہ مسئلہ حل نہ ہو گا۔ اس کے لیے علم و حکمت، اجتہاد اور جہاد تینوں کی ضرورت ہو گی۔

۹۔ نواں مسئلہ عورت اور نوجوان کا ہے۔ عورت آبادی کا نصف حصہ ہے۔ ایک طرف مسلم معاشروں میں اسے وہ مقام حاصل نہیں جو اسلام نے اسے دیا ہے، یا اسلام کی رو سے اسے دیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف مغرب نے معاشرے میں عورت کے مقام اور عورت مرد کے تعلقات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر کے، انھیں بالکل نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ آنے والے زمانے میں تہذیبی مسائل میں عورت کا مسئلہ سرفہرست ہو گا: اس کا مقام اور اس کے حقوق۔ اس مسئلے پر بھی ہمارے ہاں بڑا فکری اور عملی خلا ہے، جس کو پر کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح مسلمان معاشروں میں آبادیوں کا نصف سے زیادہ حصہ ۳۰ سال سے کم عمر کے نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ ان نوجوانوں کو اپنے ایمان و اقدار اور اپنی تہذیب و ثقافت کا وارث بنائے بغیر غلبہ دین کے مقصد میں کامیابی کا خواب نہیں دیکھا جا سکتا۔ لیکن اسلامی تحریکات اس مقصد کے لیے بھی کوئی واضح فکر اور لائحہ عمل نہیں بنا سکی ہیں۔

۱۰۔ آخری مسئلہ خود احتسابی، اپنی غلطیوں کے اعتراف، اور اپنی اصلاح کا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ احتساب پر سارے زور کے باوجود، غلبہ دین کے لیے کام کرنے والی تنظیمیں اور تحریکیں، اپنی اجتماعی روش، پالیسیوں اور اقدامات کے سلسلے میں احتساب و استغفار کے بجائے تاویل و پردہ پوشی کو ترجیح دیتی ہیں۔ نصف صدی کے عرصے میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی اجتماعیت نے اپنی غلطیوں کو تسلیم کیا ہو، اور ان کی اصلاح کا اعلان کیا ہو۔ حالانکہ قوموں اور جماعتوں کی دنیوی کامیابیوں میں خود احتسابی اور استغفار کو قرآن مجید نے کلیدی اور مرکزی مقام دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ کو خامیوں اور غلطیوں سے مفر نہیں۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ کسی انسانی گروہ سے نصف صدی میں کوئی بڑی غلطی نہ سرزد ہوئی ہو گی۔ ہمارے

ہاں دنیا بھر کی خرابیوں اور غلطیوں پر قراردادیں مل جائیں گی' اپنی خرابیوں اور غلطیوں پر کوئی قرارداد نہیں ملے گی۔

ہمارا خیال ہے کہ پبلک میں اور پبلک کے لیے کام کرنے والی جماعتوں کو پبلک کے سامنے ہی اپنا احتساب کرنا چاہیے' اپنی غلطیوں کی تاویل یا پردہ پوشی کے بجائے ان کا اعتراف کرنا چاہیے' اپنی اصلاحی تدابیر کا اعلان بھی کرنا چاہیے۔ اس سے ان کی عزت' دلوں میں مقام' اور ان کے دائرہ اثر و حمایت میں کمی نہیں آئے گی' اضافہ ہو گا۔ صحت مند اور مفید روایات قائم ہوں گی۔ رگوں میں نیا خون دوڑے گا' اصلاح کے دروازے کھلیں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ غلبہ دین کی جدوجہد کے مختلف پہلوؤں پر جائزے' غور و خوض' نظرثانی' تجدید یا تغیر کا عمل شروع ہو جائے گا تو نصف صدی کی محنت سے جو پھل ہم نے جمع کیے ہیں' وہ گلنے اور ضائع جانے کے بجائے برگ و بار لائیں گے۔ قوموں اور جماعتوں کے لیے انحطاط' زوال اور بگاڑ مقدر نہیں' نہ جمود اور تعطل۔ اجتہاد و جہاد سے قوت اور شباب کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ مَاشَآءَ اللّٰہُ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

کلام نبویؐ کی صحبت میں

خرم مراد

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ماہ شعبان کے آخری دن تقریر کی اور فرمایا:

اے لوگو' ایک بڑی عظمت والا مہینہ تم پر سایہ فگن ہو رہا ہے: یہ بڑی برکت والا مہینہ ہے۔ یہ ایسا مہینہ ہے کہ جس کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مہینے میں روزہ رکھنا فرض کیا ہے' اور اس مہینے کی راتوں میں قیام کرنے اور نماز پڑھنے کو نفل (اور اپنے قرب کا ذریعہ) قرار دیا ہے۔

جو شخص اس مہینے میں کوئی ایک نیک کام اپنے دل کی خوشی سے بطور خود کر کے اللہ کا قرب چاہے گا' اس کو اتنا ثواب ہو گا جیسے کہ رمضان کے سوا اور مہینوں میں فرض ادا کیا ہو۔ اور جو اس مہینے میں کوئی فرض ادا کرے گا' اس کو اتنا ثواب ہو گا جیسے کہ اس نے رمضان کے سوا دوسرے مہینے میں ستر فرض ادا کیے۔

یہ مہینہ صبر کا مہینہ ہے' اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔

اور یہ مہینہ مواساۃ اور ہمدردی کا مہینہ ہے۔

یہ ایسا مہینہ ہے جس میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔

جو اس مہینے میں کسی روزے دار کو افطار کرائے گا اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے' اور اس کی گردن آگ سے چھڑا دی جائے گی' اور اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا روزے دار کو' اس کے بغیر کہ روزے دار کے اجر میں کوئی کمی آئے۔

(حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں) ہم نے پوچھا: ہم میں سے ہر ایک کے پاس اتنا نہیں ہوتا کہ ایک روزے دار کو افطار کرا سکے؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو ایک گھونٹ دودھ' ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی سے بھی کسی کا روزہ افطار کرائے گا۔ جو روزے دار کو سیر ہو کر کھانا کھلائے گا' اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے اس

طرح سیر کرے گا کہ وہ کبھی پیاسا نہ ہو گا یہاں تک کہ جنت میں داخل ہو جائے۔
یہ ایسا مہینہ ہے جس کا اول رحمت ہے، جس کے درمیان میں گناہوں کی بخشش ہے، اور جس کے آخر میں آگ سے چھٹکارا ہے۔ (البیہقی، بہ حوالہ مشکوٰۃ کتاب الصوم)

دن سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن بعض دن اپنے دامن میں برکتوں کے بڑے بڑے خزانے رکھتے ہیں۔ بہار کے دن آتے ہیں، تو چند لمحوں میں وہ فصلیں لہلہاتی ہیں، وہ پھل پھول پیدا ہوتے ہیں، کہ دوسرے موسم میں مہینوں برسوں میں بھی اتنا نشوونما نہیں ہو سکتا۔

رمضان کا مہینہ بھی نیکی اور تقویٰ کا موسم بہار ہے، اجر و ثواب میں بے انتہا نشوونما کا موسم ہے، قرب الٰہی میں اضافے کے بیش بہا مواقع فراہم کرتا ہے۔

نوافل کی بڑی سے بڑی مقدار بھی ایک چھوٹے سے فرض کے برابر نہیں ہو سکتی۔ یہ رمضان کی بہار ہے کہ ہر نفل کا ثواب فرض کے برابر، ہر فرض کا ۷۰ فرض کے برابر۔ اور ایک رات میں اجر و قرب اور تزکیے کا وہ کام جو ہزار ماہ میں بھی نہ ہو سکے! طبعی دنیا میں یہ معجزہ ہر موسم بہار میں دیکھا جا سکتا ہے، روح و اخلاق کی دنیا میں بصیرت کی آنکھ یہی معجزہ ہر رمضان میں ظہور پذیر ہوتے دیکھ سکتی ہے۔

صبر دین و دنیا کی کامیابیوں کی کلید ہے۔ صبر کے معنی اپنے نفس پر قابو کے ہیں: جو کرنے کو کہا جائے، وہ کرے، جس سے رکنے کو کہا جائے اس سے رک جائے۔ اپنے مقصد سے بندھا رہے، اپنا راستہ چلتا رہے--- کوئی بھی خواہش و کشش ہو، کوئی بھی مزاحمت و تکلیف ہو، جو راہ سے ہٹانا چاہے۔

جنت، آخرت کا حاصل ہے۔ دنیا میں سلامتی اور باہمی ہمدردی، خصوصاً مالی ہمدردی، یہی عبادات کا حاصل ہے۔ اسی لیے حضورؐ رمضان میں ہر سائل کو عطا کرتے، اور بارش بھری ہوا سے بھی زیادہ سخی ہو جاتے۔ باہمی ہمدردی میں حقیر سے حقیر شے کو بھی بے وقعت نہ سمجھو، وہ عظیم نتائج بر آمد کر سکتی ہے۔ ایک کھجور! ایک گھونٹ پانی یا دودھ!

زمانی ترتیب بھی ہو سکتی ہے: پہلا حصہ، رحمت کے لیے، دوسرا مغفرت کے لیے، تیسرا دوزخ کی آگ سے نجات کے لیے خاص طور پر ممتاز ہے۔ معنوی ترتیب بھی ہو سکتی ہے۔ رحمت ہاتھ پکڑتی ہے، راہ چلاتی ہے، برکتوں کے دروازے کھولتی ہے۔ گناہ ہوتے ہیں تو مغفرت دست گیری کرتی ہے۔ اور بالآخر دوزخ کی آگ سے نجات۔۔ اور جنت میں داخل کیے جانے کا عظیم الشان انعام حاصل ہوتا ہے۔

موسم بہار کا ہو، زمین زرخیز ہو، دانہ موجود ہو، پانی بھی--- پھر بھی کاشت کار خالی ہاتھ رہ جائے، تو یہ اسی کی بد نصیبی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس شخص نے رمضان میں ایمان اور اجر و ثواب کے وعدوں پر یقین کے ساتھ روزے رکھے، اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ جس نے رمضان کی راتوں میں ایمان اور اجر و ثواب کے وعدوں پر یقین کے ساتھ قیام کیا، اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ جس نے لیلۃ القدر میں ایمان اور اجر و ثواب کے وعدوں پر یقین کے ساتھ قیام کیا، اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ (بخاری، مسلم، بہ حوالہ مشکوٰۃ، کتاب الصوم)

رمضان کی بہاروں سے اپنا نصیب پانے کے لیے، اعمال کے ساتھ دو شرائط ہیں: ایک ایمان، یعنی اس بات پر یقین کہ اللہ میرا رب ہے، اس سے ملاقات یقینی ہے، اس کی بندگی میں پوری زندگی گزارنا ہی اصل کام ہے۔ ایمان جو دل میں اتر جائے، اللہ سے محبت ہر محبت سے بڑھ کر کرے، صرف اللہ کے حکم و تدبیر کو غالب دیکھے۔

دوسرے احتساب، ایمان اور ہر عمل صالح پر جس اجر و ثواب کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس کا شعور، اس کے سچ ہونے پر یقین، اس پر نگاہیں، اس کے پانے کی امید و یقین۔ یہ رمضان کے اعمال ہی کے لیے نہیں، تمام اعمال کے لیے روح و جان کا مقام رکھتا ہے۔

○

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کتنے ہی روزے دار ہیں جن کو اپنے روزے سے بھوک پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور کتنے ہی قیام کرنے والے ہیں جن کو اپنے قیام میں جاگنے کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ (دارمی، بہ حوالہ مشکوٰۃ، باب تنزیہ الصوم)

روزے کا مقصد بھوک پیاس نہیں، نہ قیام لیل کا مقصد رت جگا ہے۔ روزے کا مقصد تقویٰ، ضبط نفس، صبر اور حسن اخلاق کی افزایش ہے۔ قیام لیل کا مقصد خلوت میں عبادت اور اپنے رب سے کلام ہے اور جلوت میں سخاوت، فیاضی کے ساتھ اپنا مال، وقت اور توجہ بندگان خدا کے اوپر خرچ کرنا ہے--- جتنا بھی حاصل ہو۔ اور انھیں غصے اور انانیت سے محفوظ رکھنا ہے۔

بدقسمت ہے وہ آدمی جو جائز کھانا پینا چھوڑ دے، نیند ترک کر دے، لیکن ناجائز چیزیں جو اللہ کو ناراض کرنے والی ہیں، نہ چھوڑے۔

○

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو شخص اللہ کے خوف سے روئے' وہ دوزخ کی آگ میں نہیں جائے گا' یہاں تک کہ دودھ تھن میں لوٹ آئے۔ اور اللہ کی راہ کی دھول گرد اور دوزخ کا دھواں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے (ترمذی)

دودھ کا تھن میں واپس لوٹنا' ایک غیر ممکن بات کی تصویر ہے۔ جس کا دل اللہ کی خشیت و خوف سے نرم ہو' اسی کی آنکھ نم ہو گی اور وہ روئے گا۔ جو اللہ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے گا' اس کے لیے دو جنتوں کی بشارت ہے: **وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔**

دل سے نکلنے والی آہ اور آنکھ سے نکلنے والا آنسو --- دونوں ہی بڑی قیمتی دولت ہیں۔ رمضان کی راتوں سے زیادہ اچھا یہ دولت کمانے کا موقع اور کب ملے گا۔

اللہ کی راہ میں گرد و غبار کا مقام بھی وہی ہے جو اللہ کو یاد کر کے اس کے خوف سے آنسو کا۔

○

حضرت عدی بن حاتمؓ کہتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آگ سے بچو!"۔

یہ فرمانے کے بعد حضورؐ نے رخ مبارک پھیر لیا۔ اس کے بعد آپؐ نے پھر فرمایا: "آگ سے بچو!" اور پھر آپؐ نے رخ مبارک پھیر لیا۔ تین بار آپؐ نے اسی طرح رخ مبارک پھیرا' یہاں تک کہ ہم نے سمجھا کہ آپؐ آگ کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا:

(اس) آگ سے بچو' اگر کھجور کا آدھا ٹکڑا ہی دے سکو (تو اللہ کی راہ میں دو)۔ جس کے پاس یہ بھی نہ ہو تو اچھی بات کہہ کر آگ سے بچے (بخاری' کتاب الرقاق)

دوزخ کی آگ سے بچنے کی فکر دل و جان کے ساتھ لگی ہونا چاہیے۔

یہ ان دیکھی آگ نگاہوں میں اسی طرح رہنا چاہیے' بہ حد استطاعت' جیسے دنیا کی آگ۔

صدقہ سے زیادہ آگ کو بجھانے والی چیزیں کم ہیں۔ کھجور کا آدھا ٹکڑا بھی میسر ہو تو وہ اللہ کی محبت کی خاطر اس کی راہ میں دے ڈالو۔

جس کا ہاتھ اتنا خالی ہو کہ اتنی حقیر چیز بھی میسر نہ ہو' وہ بھلی بات کہے۔ میٹھی بات کرے' اخلاق سے پیش آئے' دلوں کو حوس کرے' سچ بولے' نصیحت کرے' امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے۔

فیوضِ رمضان

افادات مولانا اشرف علی تھانویؒ

اخذ و تدوین: خرم مراد

قیام رمضان، تقلیل منام

تراویح قیام رمضان کا نام ہے۔ یہ رمضان کے ساتھ مخصوص ہے، اور احادیث میں اس کو قیام رمضان سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے کہ تراویح تہجد سے الگ کوئی عبادت ہے، کیونکہ تہجد رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جس طرح صوم کو تقلیل طعام میں دخل ہے، اسی طرح تراویح کو تقلیل منام میں دخل ہے۔ اور جیسا روزہ میں تبدیل عادت کی وجہ سے مجاہدہ کی شان آئی تھی، اسی طرح یہاں بھی شریعت نے محض تبدیل عادت سے مجاہدہ کا کام لیا ہے۔ کیوں کہ عام عادت یہی ہے کہ اکثر لوگ عشا کے بعد فوراً سو رہتے ہیں تو نیند کے وقت میں تراویح کا حکم دے کر عادت کو بدل دیا۔ اس سے نفس پر گرانی ہوتی ہے جو کہ مجاہدہ ہے۔ پھر عموماً نیند کا وقت نکل جانے کے بعد دیر میں نیند آتی ہے۔ اس طرح بھی تقلیل منام ہو جاتی ہے۔ تراویح سے مجاہدہ کا ثمرہ اس طرح بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ آزادی کے ساتھ جاگنا گراں نہیں ہوتا مگر نیند کی آمد کے ساتھ فوراً ہی گرانی شروع ہو جاتی ہے۔ شریعت نے اس راز کو سمجھا اور تقلیل منام کے لیے عجیب مجاہدہ تجویز کیا ہے۔ واللہ شریعت پر تو یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ (مفہوم) بے شک جہاں بھی نظر ڈالتا ہوں حسن میرے دل کا دامن کھینچتا ہے کہ بس اسی پر نظر جمائے رہ۔

غرض شریعت نے رمضان میں صرف بیس رکعت تراویح مقرر کر کے تقلیل منام کی ایک معتدل صورت کر دی۔ دوسرے طریقوں میں مرتاضین آنکھیں پھوڑتے تھے، چھت میں رسیاں باندھتے تھے کہ جب نیند آتی اس میں لٹک جاتے، جس سے نیند اڑ جاتی تھی۔

تم کو حکمت و اسرار جاننے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بس خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سمجھ کر عمل شروع کر دو۔ آخر اگر کوئی ڈاکٹر تم کو گولیاں دے دے تو ان کو جلدی سے منہ میں کیوں دبا لیتے ہو۔ روزہ میں اور تراویح میں کچھ ہی اسرار ہوں تم کو اس سے کیا بحث، تم کو عمل سے کام ہے۔ مقصود تو رضائے

حق ہے اور وہ عمل سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اسرار کے جاننے پر رضا موقوف نہیں۔

اہل ریاضت تقلیل منام کے لیے جو صورتیں مجاہدات کی اختیار کرتے ہیں ان کو دیکھ کر پھر شرعی مجاہدہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے کیا شاہانہ علاج کیا ہے۔ نہ آنکھیں پھوڑنے کی ضرورت ہے' نہ رسیاں باندھنے کی' نہ سیاہ مرچیں چبانے کی' بلکہ بیس رکعت تراویح عشا کے بعد پڑھ کر سو رہو' تقلیل منام ہو گیا۔

پھر مزید لطافت یہ کہ تراویح جماعت سے ہوتی ہے۔ الگ الگ جاگنا مشکل تھا' جماعت کے ساتھ جاگنا اور بھی سہل ہو گیا۔ پھر بیچ میں ہر چار رکعت پر قدرے توقف مستحب کیا گیا' جس میں اگر کسی کو نیند آنے لگے تو وہ ٹہل سکتا ہے' پانی منہ میں ڈال سکتا ہے۔

اس تقلیل کو تہجد سے اور تقویت ہو جاتی ہے۔ خصوصاً لیالی قدر میں۔ ان راتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے تمام اجزا سے زیادہ جاگنے کا اہتمام فرمایا ہے۔ ان راتوں میں حضورؐ ازواج مطہرات کو بھی اہتمام کے ساتھ جگاتے تھے۔ پھر ان میں بھی شریعت نے ہماری کس قدر رعایت کی ہے کہ لیالی قدر پے درپے نہیں ہیں بلکہ طاق راتیں ہیں۔ بیچ میں ایک ایک رات کا فصل رکھا گیا ہے تاکہ ایک رات زیادہ جاگ کر بیچ کی رات میں زیادہ سو لو۔ اور تہجد کے لیے جاگنا خاص رمضان کی راتوں میں کچھ بھی مشکل نہیں کیونکہ سحری کے لیے اکثر لوگ اٹھتے ہی ہیں تو کھانے سے پہلے کچھ رکعتیں نماز کی پڑھ لینا کیا دشوار ہے۔ اسی لیے جو شخص تہجد کا عادی بننا چاہے اس کو رمضان میں عادی بننا نہایت آسان ہے' کیونکہ اس میں تہجد کے لیے اٹھنا مشکل نہیں' سحری کھانے سب ہی اٹھتے ہیں۔

عمل' قربِ الٰہی کا ذریعہ

شریعت نے ایک اور رعایت کی ہے جس پر سو جان سے فدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔ وہ یہ کہ مجاہدہ مرتاضین کے نزدیک تو محض ترک کا نام ہے' مثلاً ترک طعام و ترک منام وغیرہ' مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ترک پر اکتفا نہیں کیا۔ آپ نے اس کے ساتھ افعال بھی مشروع فرمائے ہیں۔ مجاہدات حقیقیہ یہ اعمال ہی ہیں' اور تروک تو مجاہدات حقیقیہ کے لیے معاون ہونے کے سبب مجاہدہ کے حکم میں ہیں۔ وجہ یہ کہ قرب الی اللہ کے لیے اعمال ہی ذریعہ ہیں۔ مثلاً روزہ میں صرف ترک طعام پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اور کام بھی مشروع کیے گئے ہیں۔ عملاً بھی اور قولاً بھی۔

عملاً تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان حدیث شریف میں یوں وارد ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو ہر وقت ہی سب سے زیادہ سخی تھے مگر سب سے بڑھ کر رمضان میں آپ سخی ہوتے تھے' اور جبریل علیہ السلام شب میں آپ سے ملتے تھے' ان کی ملاقات کے وقت آپ ہوا سے بھی زیادہ فیض رساں

ہوتے تھے۔ اس سخاوت میں سے بعض کی تصریح بھی وارد ہے۔ مشکوٰۃ میں بیہقی سے بروایت ابن عباس' آیا ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان مبارک میں ہر قیدی کو آزاد فرما دیتے تھے اور ہر سائل کو عطا فرماتے تھے۔ اس طرح آپؐ نے عملی تعلیم فرمائی ہے کہ رمضان میں اور دنوں سے زیادہ فیض رساں ہونا چاہیے۔

اور قولاً یہ کہ' آپ ارشاد فرماتے ہیں: یہ مہینہ ہمدردی کا ہے' اس مہینہ میں مومن کا رزق زیادہ کیا جاتا ہے' جو اس میں نفل کرے اس کو اور دونوں کے فرض کے برابر ثواب ملے گا۔ اس میں کس قدر ترغیب و تحریص ہے۔ صدقہ خیرات اور اعمال صالحہ کی! کہ رمضان میں رکعات نافلہ کا ثواب فرض نمازوں کے برابر ملتا ہے۔ صدقہ نافلہ کا ثواب قرض صدقہ کے برابر ملتا ہے' اور جو فرض کو اس ماہ میں ادا کرتے ہیں ان کو ستر فرضوں کا ثواب ملتا ہے۔

مگر اس سے بعض لوگوں نے کیسا الٹا مطلب سمجھا! بعض لوگ رمضان سے پہلے بعض نیک کاموں کو روکے رکھتے ہیں۔ مثلاً کسی کی زکوٰۃ کا سال شعبان میں پورا ہو گیا۔ اب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا۔ رمضان کے انتظار میں روکے رکھتا ہے' چاہے رمضان میں اس کو توفیق ہی نہ ہو' روپیہ چوری ہی ہو جائے یا رمضان کے انتظار میں محتاج کا قلیہ ہی ہو جائے۔ یاد رکھو شارع کا اس ترغیب سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رمضان کے انتظار میں نیک کاموں کو روکا جائے بلکہ شارع کا مقصود یہ ہے کہ اگر رمضان تک کسی کو توفیق نہ ہوئی ہو تو رمضان آنے کے بعد ہرگز دیر نہ کرے' جو کرنا ہو' کر ڈالے۔ رمضان سے پہلے کرنے سے روکنا مقصود نہیں۔ ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ مگر کم فہمی نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ لوگ رمضان میں خرچ کرنے کے فضائل اور ثواب سن کر اس کے انتظار میں طاعات کو روکنے لگے۔ خوب سمجھ لو کہ نیکی میں جلدی کرنے میں خود بہت بڑا ثواب ہے۔ اور وہ اتنا بڑا ثواب ہے کہ رمضان سے پہلے جو تم خرچ کرو گے تو گو اس میں بہ نسبت رمضان میں خرچ کرنے کے' مقدار میں ثواب کم ہو' مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ قرب الٰہی کے لیے وہ تعجیل بہتر ہے' اور اس درجہ میں اس کا ثواب رمضان کے ثواب سے بڑھ جائے گا۔ تمھیں کیا خبر ہے کہ شعبان میں اگر تم غریب کو زکوٰۃ دے دیتے' تو اس وقت اس کے دل سے کیسی دعا نکل جاتی جس کے سامنے ستر رمضان بھی ہیچ ہیں۔ یہی بات تو لوگوں کو معلوم نہیں۔ یاد رکھو جب زکوٰۃ کا سال پورا ہو جائے اس کے بعد تاخیر کرنے میں فقہا کا اختلاف ہے کہ اس تاخیر سے گناہ ہوتا ہے یا نہیں۔ احتیاط اسی میں ہے کہ وجوب کے بعد دیر نہ کی جائے تاکہ سب کے نزدیک گناہ سے محفوظ رہے۔ اگر رمضان کے انتظار میں صدقات کا روکنا موجب ثواب ہوتا تو شریعت نے کہیں تو یہ کہا ہوتا کہ رمضان سے اتنے دن پہلے تمام صدقات کو روک دو۔ جب شریعت نے کہیں یہ نہیں کہا تو اب ہمارا ایسا کرنا دین میں اضافہ اور بدعت ہے کہ جس کام کے لیے

شریعت نے ثواب بیان نہیں کیا تم اس کو ثواب سمجھ کر کرتے ہو۔

اسی طرح تقلیل منام میں بھی محض اس پر اکتفا نہیں کیا کہ خالی بیٹھے جاگتے رہو، بلکہ فرماتے ہیں: نیک بندے رات کو کم سویا کرتے تھے اور پچھلے حصہ شب میں استغفار کیا کرتے تھے۔ یہاں تو استغفار مشروع ہوا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (السجدہ ۳۲:۱۶) ان کے پہلو خوابگاہوں سے الگ رہتے ہیں، اپنے پروردگار کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں۔ یہاں مفسرین کا قول یہ ہے کہ یدعون سے یصلون مراد ہے۔ مطلب یہ کہ رات کو نماز پڑھتے ہیں۔ مگر طرز کلام سے عموم ظاہر ہو رہا ہے، لہٰذا مطلق دعا و ذکر بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اسی لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو تہجد کی توفیق نہ ہو تو رات کو کسی وقت جاگ کر تین بار سبحان اللہ کہہ کر ہی سو رہا کرے۔ وہ بھی یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا میں داخل ہو جائے گا۔ بس دو تین بجے جب آنکھ کھل جائے سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ لیا کرے۔ یہ تسبیح بھی کام آ جائے گی۔ حق تعالیٰ کے یہاں بڑی رحمت ہے۔ ان شاء اللہ آپ کا رات کو کروٹیں بدلتے ہوئے اللہ اللہ کر لینا کام آ جائے گا اور آپ تہجد والوں میں شمار ہو جائیں گے۔ اگرچہ بے نماز کے تہجد ہو گی۔

غرض شریعت نے جاگنے کے ساتھ ذکر و استغفار و صلوٰۃ کو بھی مشروع فرمایا ہے محض بیداری پر اکتفا نہیں کیا۔ پھر اس میں ایسی بھی کوئی یہ قید نہیں کہ دو بجے اٹھو یا تین بجے اٹھو۔ بس صبح سے پہلے اٹھنا چاہیے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ کہ رات اور دن کا پورا اندازہ حق تعالیٰ ہی کرتے ہیں۔ یہ جملہ بے کار نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اندازہ ٹھیک طور پر نہیں کر سکتے کہ ہمیشہ ایک ہی وقت پر اٹھو۔ اس لیے کسی خاص وقت کی تعیین لازم نہیں کی جاتی۔ جب آنکھ کھل جائے اسی وقت اٹھ جانا چاہیے۔ پھر بیماروں کو اور کسب معاش کرنے والوں کو دقت تھی۔ بیماروں اور مسافروں کو زیادہ بیداری معاف ہے۔ ان کی جب آنکھ کھل جائے صبح سے پہلے پہلے وہ جتنا قرآن پڑھ سکیں نماز میں پڑھ لیا کریں، چاہے دو ہی رکعت پڑھ لیا کریں۔ اس سے بھی کامل ثواب مل جائے گا۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو حدیث میں آتا ہے کہ بعد وتر کے دو رکعت پڑھ لیا کرے۔ اس کی نسبت کفتاہ وارد ہے، جس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے بھی تہجد کا ثواب مل جاتا ہے۔ سبحان اللہ۔

مطلوب عمل ہے، کیفیت نہیں

بعض لوگ مجاہدات بہ معنی ترک ہی کو مقصود سمجھ لیتے ہیں۔ غضب یہ ہے کہ بکثرت اہل علم کا بھی یہی حال ہے گو اعتقاد نہ ہو۔ وہ کم کھانے، کم سونے، کم بات کرنے، کم ملنے جلنے کو نہایت اہتمام سے اختیار کرتے ہیں، اور گو جانتے ہیں کہ ان سے مقصود سہولت فی الاعمال ہے مگر باوجود اس کے پھر کیفیات کو مقصود

سمجھتے ہیں اور اعمال کو اصل مقصود نہیں سمجھتے۔ گو ان کا یہ اعتقاد نہ ہو مگر برتاؤ یہی ہے۔ چنانچہ مجاہدات کے بعد جب کیفیات ذوق و شوق و نشاط کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ کام میں لگے رہتے ہیں۔ جہاں کبھی کسی وجہ سے ان کیفیات میں کمی پیدا ہوئی تو اب یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا مجاہدہ ہی بے کار ہوا اور ہمارا رتبہ خدا کے یہاں کم ہو گیا۔ پھر اس خیال کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اعمال ہی سے بے رغبتی ہو جاتی ہے۔ اب اگر جاہل ہے تو اعمال بالکل چھوٹ گئے، اور اگر پکے ہوئے تو استغفار میں لگ گئے تاکہ وہ کیفیت عود کر آئے۔ استغفار اچھی چیز ہے مگر اس حالت کا تو علاج نہیں۔ تمھارا وہ خیال ہی غلط ہے کہ میں مردود ہو گیا جس کے تدارک کے لیے استغفار کر رہے ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ کبھی تو انس کی حالت میں کیفیات میں کمی ہو جاتی ہے۔ کبھی بیماری کی وجہ سے، کبھی حق تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہوتا ہے کہ ہمارا بندہ اپنے لطف کے واسطے ہی کام کرتا ہے یا ہم اس کے مطلوب ہیں۔ یہاں استغفار سے کیسے کام چلے گا۔ اصل مقصود رضائے الٰہی ہے جس کا طریق عمل ہے۔ اور مجاہدات اس کے لیے محض سبب سہولت ہیں، خود مقصود نہیں۔ پس اگر عمل موجود ہو اور مجاہدہ کے آثار خاصہ مرتب نہ ہوں تو کچھ حرج نہیں، اور اگر مجاہدہ کے آثار خاصہ موجود ہوں اور عمل مفقود ہو تو وہ محض بے کار چیز ہیں۔

عمل کا معاملہ یہ ہے کہ اگر غیب سے یہ بھی آواز آ جائے کہ تیرا عمل کچھ قبول نہیں، تو مردود ہے، اور یقین ہو جائے کہ یہ ندا غیبی ہے، جب بھی اپنے کام میں لگا رہے اور ہرگز عمل کو ترک نہ کرے۔

شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک شخص کا قصہ لکھا ہے۔ وہ مجاہدات بہت کرتا تھا، راتوں کو تہجد پڑھتا تھا۔ مگر اس کو کیفیات تو کیا ہوتیں، ایک دن غیب سے اس کو ایسا فضیحت کیا گیا کہ رات کو جب وہ تہجد کے لیے اٹھا تو ہاتف نے آواز دی کہ جو چاہے کر، یہاں کچھ قبول نہیں۔ اور یہ آواز اس زور سے آئی کہ اس کے ایک مرید نے بھی سن لی۔ مگر وہ اللہ کا بندہ اس پر بھی اپنا کام پورا کر کے ہٹا۔ اگلی رات ہوئی تو پھر لوٹا بدھنا لے کر تہجد کو اٹھے۔ مرید نے کہا، اجی غیرت بھی کوئی چیز ہے۔ جب وہ کچھ بھی قبول نہیں کرتے تو پھر کاہے کے لیے مصیبت جھیلتے ہو، پڑ کے سو بھی رہو۔ اس کو اپنے شیخ کی حالت پر رنج تھا۔ اب شیخ کا جواب سنیے، واقعی طالب ایسے ہوتے ہیں۔ اس نے کہا: بیٹا، یہ تو معلوم ہے کہ وہ کچھ قبول نہیں کرتے، مگر ان کے سوا میرے لیے کوئی دوسرا دروازہ بھی تو نہیں کہ ان کو چھوڑ کر وہاں چلا جاؤں۔ میرے لیے تو بس یہی ایک در ہے، اسی پر جان دے دوں گا، چاہے وہ قبول کریں یا رد کریں۔

اس بلا میں ہر زمانہ میں لوگ مبتلا ہوئے ہیں کہ کیفیات کو مقصود سمجھ کر عمل کو ان کے تابع کرتے تھے۔ ذرا کیفیات میں کمی آئی، عمل کو ترک کر دیا۔ مولانا روم نے ایک شخص کا قصہ لکھا ہے: وہ ذاکر شاغل

تھا مگر اسے کچھ کیفیات وغیرہ حاصل نہ تھیں۔ شیطان نے اسے بہکایا کہ اندھیری کوٹھڑی میں ٹکریں مارتا ہے' ادھر سے نہ کچھ پیام نہ سلام نہ کیفیات نہ واردات۔ یہ عقل مند تہجد اور ذکر وغیرہ سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ گیا کہ واقعی اتنے دن کام کرتے کرتے ہو گئے' ادھر سے کچھ جواب ہی نہیں رسید بھی نہیں ملتی۔ جب یہ شخص سب کام چھوڑ کر سو رہا تو حق تعالیٰ کی طرف سے پوچھا گیا کہ آج کیوں سو رہا۔ اس نے وہی شکایت کی کہ اتنے دن کام کرتے کرتے ہو گئے' وہاں سے کوئی رسید ہی نہیں ملتی' نہ سوال ہے نہ جواب' اس لیے میں نے سب چھوڑ دیا۔ جواب ارشاد ہوا: یہ تیرا اللہ اللہ کرنا ہی ہمارا جواب ہے۔ اگر ہم کو تیرا ذکر پسند نہ ہوتا تو ہم تیری زبان سے اپنا نام نکلنے نہ دیتے۔ بلکہ زبان پکڑ لیتے' جس سے ایک دفعہ بھی اللہ نہ نکل سکتا۔ بس ایک بار اللہ کہہ کر جب دوبارہ اس کے نام کی توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلا قبول ہو گیا۔ اور یہی دوسرا ہماری طرف سے جواب ہے۔ علیٰ ہذا تمھارے دل میں جو سوز و درد ہے یہ ہماری طرف سے قاصد ہے۔ اگر ہم کو تعلق نہ ہوتا تو اپنا قاصد تیرے پاس نہ بھیجتے۔ کیونکہ ہمارا قاصد ہر شخص کے پاس نہیں جایا کرتا بلکہ جہاں ہم بھیجنا چاہتے ہیں' جاتا ہے۔

تقلیل کلام

مجاہدہ کا ایک رکن تقلیل کلام ہے۔ یہ تقلیل طعام و تقلیل منام سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ کیونکہ کھانے میں کچھ اہتمام تو کرنا پڑتا ہے' بخلاف بولنے کے کہ اس میں کچھ اہتمام ہی کرنا نہیں پڑتا۔ نہ زیادہ بولنے سے بدہضمی ہوتی ہے۔ اسی طرح سونا ہے تو اس میں کبھی تقلیل ہو گی۔ آخر کہاں تک سوئے گا' کبھی تو جاگے گا۔ بخلاف اس زبان کے چرخے کے کہ اس کی کہیں انتہا ہی نہیں۔ یہ چرخہ چلنے سے تھکتا ہی نہیں کیونکہ اس کے لیے کچھ اہتمام کرنا ہی نہیں پڑتا۔ نہ زبان چلانے سے کچھ تھکن ہوتی ہے۔

دوسرا راز یہ ہے کہ انسان جس قدر مشغلے اختیار کرتا ہے لذت کے لیے اختیار کرتا ہے۔ سو کلام کے سوا دوسرے جس قدر مشغلے ہیں' ان میں کرنے سے لذت کم ہو جاتی ہے۔ پیٹ بھرنے کے بعد پھر کھانے میں مزا نہیں آتا۔ نیند بھر جانے کے بعد پھر سونے میں لذت نہیں آتی۔ مگر بولنے کی لذت ختم نہیں ہوتی' بلکہ جتنا بولتے جاؤ اتنی ہی لذت بڑھتی جاتی ہے۔ اس لیے تقلیل کلام سب سے زیادہ دشوار ہے۔ مگر زیادہ بولنے میں آفات بہت ہیں اور اس سے گناہوں میں ابتلا بکثرت ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کی تقلیل کو مجاہدہ کا ایک رکن قرار دیا گیا۔

لیکن تقلیل کلام کا یہ مطلب نہیں کہ ضروری باتوں کو بھی کم کر دے' بلکہ مطلب یہ ہے کہ فضول کلام چھوڑ دے' گو مباح ہی ہو۔ باقی جو باتیں حرام ہیں' جیسے جھوٹ اور غیبت و بہتان وغیرہ' وہ تو اس سے خود ہی چھوٹ جائیں گے۔ رہا ضروری کلام' سو اس کا ترک کرنا جائز نہیں' کیونکہ اس سے یا ضروریات میں

حرج یا مخاطب کو تکلیف ہو گی۔ شریعت مقدسہ نے ضروری کلام کے واسطے نماز تک قطع کرنے کا حکم دیا ہے۔ مثلاً کوئی اندھا جا رہا ہو اور اس کے سامنے گڑھا ہو جس میں اس کے گرنے کا اندیشہ ہے' تو اگر تم نماز بھی پڑھ رہے ہو' تب بھی واجب ہے کہ اندھے کو گرنے سے بچاؤ' نماز کو توڑو اور اس سے کہو کہ ذرا بچ کر چلے' آگے گڑھا ہے۔ ایسے وقت میں خاموشی گناہ ہے' بلکہ نماز توڑ کر نابینا کو گڑھے میں گرنے سے بچانا واجب ہے۔ مگر آج کل کے وظیفچی نماز کو تو چاہے توڑ دیں مگر وظیفہ کو نہیں توڑ سکتے۔ اس میں بات کرنے کی مجال نہیں' چاہے کسی پر کچھ ہی آ بنے۔ اللہ بچائے ایسے وظیفوں سے۔ آج کل وظیفوں کے ساتھ قرآن سے بھی زیادہ ادب کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ قرآن پڑھتے ہوئے تو دنیا کی ہزار باتیں کرلیں اور وظیفہ پڑھتے ہوئے دین کی ضروری بات بھی نہیں کرتے۔

تلاوتِ قرآن

تقلیل کلام کی ایک صورت تو یہ ہے کہ زبان کو بند کر لیا جائے' روزہ میں کسی سے بات ہی نہ کی جائے۔ یہ طریقہ ہماری شریعت میں نہیں ہے۔ اتنے طویل سکوت سے دنیوی کاروبار بھی بند ہو جائیں گے' اور بہت سے ضروری کاموں میں خلل پڑے گا۔ دین کے کام بھی مثل وعظ و تبلیغ وغیرہ کے بند ہو جائیں گے۔ ہاں نماز میں سکوت مشروع ہے' مگر نماز تھوڑی دیر کی عبادت ہے۔ روزے میں ایک دوسرے طریقے سے تقلیل کلام کی رعایت کی گئی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح زبان بھی ایک وقت میں دو قسم کی باتیں نہیں کر سکتی۔ مثلاً جو شخص کتاب پڑھ رہا ہو وہ کتاب پڑھتے ہوئے بات نہیں کر سکتا' اگر بات کرے گا تو اس وقت کتاب نہ پڑھے گا۔ شریعت نے روزے میں کلام کو تو ممنوع نہیں کیا' لیکن نفس اور زبان کو دوسرے کلام کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس طرح کہ روزے میں تلاوت قرآن کا اور ایام سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ تراویح میں ایک قرآن ختم کرنا جبکہ کوئی عذر نہ ہو' حسب قول مشہور' سنت موکدہ کر دیا گیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں خود تلاوت قرآن کا اور دنوں سے زیادہ اہتمام فرمایا۔ چنانچہ حدیثوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ بالالتزام دور فرمانے کی تصریح ہے۔ سب مسلمانوں کو عملاً اس کی ترغیب دی ہے کہ رمضان میں تلاوت قرآن زیادہ کریں' خواہ وہ حافظ ہوں یا نہ ہوں' تراویح میں قرآن سنائیں یا نہ سنائیں۔ پھر آپؐ کا ارشاد ہے کہ قرآن کے ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں۔ اور یہ بھی ارشاد ہے کہ رمضان میں نفل طاعت کا ثواب فرض کے برابر ملتا ہے۔ تو اب رمضان میں تلاوت قرآن کرنے سے ایک ایک حرف پر جو دس نیکیاں ملیں گی ان میں ہر نیکی پر فرض کلام کے برابر ثواب ملے گا۔ اللہ اکبر کچھ ٹھکانا ہے اس ثواب کا' اس سے بھی لوگوں کو خواہ مخواہ تلاوت کی رغبت زیادہ ہو گی۔

رمضان میں تلاوت قرآن کا شریعت نے جو بہت ہی اہتمام کیا ہے اس میں راز یہ ہے کہ نزول قرآن آسمان اول پر رمضان ہی کے مہینے میں ہوا ہے۔ اس ماہ کو قرآن کے ساتھ خاص تعلق ہے جو دوسرے ایام کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان میں تلاوت قرآن بالمشاہدہ اور دنوں سے زیادہ آسان بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسان تلاوت قرآن میں مشغول ہو گا تو لامحالہ دنیوی باتوں میں تقلیل ہو گی، کیونکہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ تلاوت قرآن کے وقت اگر توجہ کے ساتھ تلاوت ہو، دوسری باتوں کا خیال بھی نہ آئے گا۔ ورنہ زبان تو جب تک اس میں مشغول رہے گی اس وقت تک دنیوی باتوں سے رکی رہے گی۔ اس طرح سے تلاوت قرآن کے ذریعے تقلیل کلام ہو جائے گی۔ پھر محض یہی نہیں کہ تقلیل کلام کا مجاہدہ حاصل ہو گیا اور کوئی نفع حاصل نہ ہو۔ بلکہ اس میں ثواب بھی اتنا ہوتا ہے کہ کسی طاعت میں اتنا ثواب نہیں۔ ایک حرف پر سات سو نیکیاں تک ملتی ہیں، بلکہ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ، یعنی سات سو پر بھی انتہا نہیں، بلکہ خدا تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس سے بھی زیادہ دیتے ہیں۔

اب بتلایئے اگر شریعت بھی تقلیل کلام کی وہی صورت تجویز کرتی جو اہل ریاضت میں مستعمل ہے، کہ بس زبان کو گوند لگا دیا جائے اور بالکل خاموش بیٹھے رہا کریں، تو یہ دولت بے شمار کیوں کر حاصل ہو سکتی؟ شریعت کے قربان جایئے کہ اس نے مجاہدہ تقلیل کلام کی وہ صورت تجویز کی جس سے اس مجاہدے کا فائدہ بھی حاصل ہو جائے کہ زبان گناہوں سے بچی رہے، فضول باتیں کرنے کی عادت کم ہو جائے، اور اس کے ساتھ ثواب بھی بے شمار ملتا رہے۔ اور ثواب ہی پر بس نہیں، بلکہ تلاوت قرآن میں بندے کو حق تعالیٰ کا ایک خاص قرب بھی حاصل ہوتا ہے، جو خاموش رہنے میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن میں ایک خاص تجلی ہے۔ جب اس کا ظہور قلب پر ہوتا ہے تو دل میں حق سبحانہ کے سوا کسی کی گنجایش نہیں رہتی۔ قلب عظمت حق سے پر ہو جاتا ہے۔

ان باطنی دولتوں کے ساتھ قرآن میں ایک ظاہری لذت بھی ہے، جس کی وجہ سے کثرت تلاوت قرآن آسان ہو گی۔ اگر ذرا سا بھی ذوق ہو تو قرآن سے زیادہ کوئی کلام لذیذ نہیں۔ اس میں وہ لذت ہے کہ جتنا پڑھتے جاؤ، لذت بڑھتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کثرت تلاوت سے جی نہیں گھبراتا۔ بعض خدا کے بندے روزانہ ایک ختم کرتے ہیں۔ اگر قرآن میں یہ لذت نہ ہوتی تو بھلا روزانہ ایک ختم ہو سکتا تھا! ہرگز نہیں۔

بعض کلاموں میں یہ کمال ہوتا ہے کہ ان میں بغیر سمجھے بھی لطف آتا ہے۔ قرآن میں یہ صفت سب سے زیادہ ہے۔ اگر خدا نے فہم معانی کی بھی توفیق دی ہے، پھر تو اس لذت کا پوچھنا ہی کیا۔ بعض لوگ جن کو معانی قرآن کا ذوق ہے، ایک ایک آیت پر گھنٹوں وجد کرتے ہیں۔ بعض اللہ کے بندوں نے ایک ہی آیت کے تکرار میں رات سے صبح کر دی ہے۔ روتے جاتے ہیں اور ایک ہی آیت کو بار بار پڑھتے جاتے ہیں، پھر

بھی لذت ختم نہیں ہوتی۔ اگر کوئی صحیح قرآن پڑھنے والا ہو اور اس کے ساتھ خوش آواز بھی ہو' اس کا قرآن سنیے' واللہ بغیر سمجھے بھی وہ لطف آئے گا جو کسی کلام میں نہ آئے گا۔

قرآن میں ایک بات یہ ہے لا یخلق من کثرۃ الرد کہ یہ کلام بار بار پڑھنے سے پرانا نہیں ہوتا۔ ہر دفعہ تازہ کلام معلوم ہوتا ہے۔ کوئی غزل کیسی ہی عمدہ ہو' دس مرتبہ سن لو تو پھر اس کے سننے میں مزا نہیں آتا بلکہ جی گھبرانے لگتا ہے۔ قرآن کو نہ معلوم کتنی مرتبہ سنا ہو گا اور کتنی مرتبہ پڑھا ہو گا' یہ پرانا نہیں ہوتا۔ ہر دفعہ نیا لطف آتا ہے' بلکہ بار بار ختم کر کے پھر شروع کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں' اگر کسی دن ان کا معمول پورا نہ ہو اور تلاوت کا موقع نہ ملے' تو دن بھر ان کا دل برا رہتا ہے۔ جیسے بھوکے پیاسے کو روٹی اور پانی کی طلب ہوتی ہے' اس طرح ان کا دل تلاوت کو ترستا رہتا ہے۔ جب قرآن پڑھ لیتے ہیں اس وقت تسلی ہوتی ہے' جیسے بھوکے کو غذا مل گئی' پیاسے کو پانی مل گیا۔

غرض شریعت نے عجیب مجاہدہ تجویز کیا ہے۔ اس میں تقلیل کلام کے ساتھ ظاہری لذت بھی ہے' اس کی کثرت قلب پر گراں بھی نہیں ہوتی۔ پھر اس میں قرب بھی بے انتہا ہے' ثواب بھی بے شمار ہے۔ شریعت نے یہ نہیں کہا کہ روزے میں زبان بند کر لیا کرو' کیونکہ اس سے صرف تعلق مع الخلق میں کمی ہو گی' تعلق مع الحق میں کیا زیادتی ہوئی۔ نتیجہ وہی ہو گا کہ دل دونوں سے خالی ہو جائے گا۔ بلکہ یہ کہا کہ قرآن کی تلاوت میں مشغول رہو۔ اس سے تعلق مع الخلق کی کمی کے ساتھ تعلق مع الحق بڑھتا رہے گا۔ اب دل خالی نہ ہو گا۔ ایک چیز نکلے گی اور اس کی جگہ تعلق مع اللہ بھرے گا' تو دل شیطان سے بالکل محفوظ رہے گا۔

---

۶۰ سال پہلے

۵۹۔ آپؐ نے لوگوں کو سڑکوں پر بیٹھنے سے منع فرما دیا کہ یہ نظربازی اور محارم کی تاک جھانک اور شہد پن کا ذریعہ نہ بن جائے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ کبھی ایسا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ فرمایا' راستے کو اس کا حق ادا کرو۔ پوچھا' راستے کا حق کیا ہے؟ فرمایا: نظریں نیچی رکھو' راہ گیروں کو تکلیف دینے سے باز رہو۔ اور سلام کا جواب دو۔

۶۵۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے غلام اور لونڈی کو عبدی و امتی (میرا بندہ یا میری بندی) نہ کہے بلکہ فتای و فتاتی (میرا چھوکرا یا میری چھوکری) کہا کرے۔ اس طرح آپؐ نے لونڈی' غلاموں کی نسبت سے آقا کے لیے رب کا لفظ استعمال کرنے کی بھی ممانعت فرمائی۔ اگرچہ "رب" کے معنی مالک کے بھی ہیں جیسے رب الدار' گھر کا مالک اور رب الابل' اونٹ کا مالک' لیکن انسان کے مقابلے میں انسان کے لیے "عبد" یا "رب" کے الفاظ استعمال کرنے سے شرک فی اللفظ ہوتے ہوتے شرک فی المعنی کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا آپؐ نے لونڈی' غلاموں کے لیے عبد اور امۃ کے الفاظ کو فتیٰ اور فتاۃ سے بدل دیا۔ اور آقا کے لیے رب کے بجائے سید کا لفظ استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی۔

۸۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاقات کے وقت جھکنے اور سر و کمر کو خم کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ آج بہت سے لوگ جو عالم کہلاتے ہیں مگر سنت کا علم نہیں رکھتے' اس سنت کی مخالفت میں اتنا مبالغہ کر رہے ہیں کہ انسانوں کے سامنے رکوع کی حد تک جھک جانے کو بھی جائز رکھتے ہیں۔ اور ایک جماعت تو اپنے زندہ اور مردہ شیوخ کے سامنے اس قدر جھکتی ہے کہ سجود کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔ ایک تیسرا طائفہ ہے جو اس کو جائز رکھتا ہے کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھے اور لوگ اس کے سامنے کھڑے ہوں۔ ان تینوں گروہوں نے نماز کی ایک ایک چیز لے لی ہے۔ ایک نے رکوع لیا۔ دوسرے نے سجود اور تیسرے نے قیام۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی انسان کے سامنے سر اور کمر کو محض خم کرنا بھی جائز نہ رکھا تاکہ یہ تعبد لغیر اللہ کا سبب نہ بن جائے۔ حتیٰ کہ آپؐ نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ جو شخص بیٹھ کر نماز پڑھا رہا ہو اس کے پیچھے لوگ کھڑے ہو کر نماز پڑھیں۔ گو یہ قیام خدا کی عبادت ہی کے لیے ہے۔ مگر آپؐ کی حکیمانہ نظر دیکھ رہی تھی کہ مخلوق کی تعظیم اور عبودیت میں قیام کرنے کا بھی ایک خفیف ترین شائبہ اس کے اندر موجود ہے' اس لیے آپؐ نے اس کا قلع قمع کر دیا۔

(سدباب ذریعہ' اصول تشریع میں سے ایک اصل عظیم۔ از افادات علامہ ابن القیمؒ' جلد ۹' عدد ۵' ذیقعد ۵۵' جنوری ۳۷)

دعوت الی الخیر کی ذمہ داری

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

(الجمیعۃ' ۱۸ ـ ۲۲ ـ ۲۶ ـ ۲۹ جولائی اور ۱۰ ـ ۱۴ ـ ۱۸ اگست ۱۹۲۵ میں شائع شدہ اقساط سے ماخوذ)

اغیار کی تبلیغ سے جب ارتداد کی وبا پھیلتی ہے' مسلمانوں میں عام ہلچل مچ جاتی ہے۔ ہر طرف سے تبلیغ و اشاعت اسلام کی آواز بلند ہونے لگتی ہے۔ لیکن ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم آج کل کے مسلمان اس ذوق تبلیغ سے بالکل ہی ناآشنا ہیں جو کسی زمانے میں اسلام کی فاتحانہ قوتوں کا ضامن اور اس کی عالمگیری اور جہاں کشائی کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار تھا۔ اگر آج ہمارے اندر وہی ذوق موجود ہوتا تو شاید کانفرنسوں اور مجلسوں کی ضرورت ہی پیش نہ آتی' اور اغیار کی چیرہ دستیوں سے ہمارے گھر میں ماتم بپا ہونے کے بجائے خود اغیار کے مجمع میں ہمارے مذہب کی بڑھتی ہوئی قوت سے کھلبلی مچی ہوئی ہوتی۔ بعض وقت جب ہم غور کرتے ہیں کہ یہ اس مذہب کی چیخ پکار ہے جس کے عناصر ترکیبی میں دعوت الی الخیر اور تبلیغ دین الٰہی کا فرض ایک لازمی عنصر کی حیثیت سے شامل تھا' جس کے داعی نے اپنی ساری زندگی خدا کا آخری پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں صرف کر دی تھی' اور جس کے مقدس پیروؤں نے ایک صدی کے اندر اندر بحرالکاہل کے کناروں سے لے کر بحراوقیانوس کے ساحل تک کلمہ حق کی اشاعت کر دی تھی' تو ہم حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ آیا یہ وہی مذہب ہے یا ہم مسلمانوں نے بنی اسرائیل کی طرح اپنے پیغمبر کے بعد کوئی اور نیا مذہب بنا لیا ہے۔

ہماری زبانوں پر تبلیغ تبلیغ کا ورد جاری ہے اور ہم تبلیغ کے لیے انجمنیں بنا کر اسلام کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں' مگر شاید یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ اس کے پیروؤں نے عیسائیوں کی طرح مشنری سوسائٹیاں بنانے کی کوشش کی ہے' یا اس بے تابی کے ساتھ تبلیغ کا شور مچایا ہے۔ اگر کامیابی کا حقیقی راز صرف انجمن سازیوں اور شور و شغب میں ہوتا تو یقیناً ہماری ترقی کی رفتار ہمارے اسلاف سے زیادہ تیز ہونی چاہیے تھی۔ لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس سازوسامان کو لے کر ہمارا ہر قدم پیچھے اٹھ رہا

ہے' اور اس بے سامانی کے عالم میں ہمارے اسلاف کی کامیابیوں کا یہ عالم تھا کہ ان کی بدولت آج دنیا کے گوشے گوشے میں اسلام کے پیرو موجود ہیں۔ پھر آخر سوچنا تو چاہیے کہ ہم میں کس چیز کی کمی ہے اور اشاعت اسلام کا اصلی راز کیا ہے؟

مسلمان کا مقصد وجود

پروفیسر میکس ملر (Max Muller) کے بقول اسلام دراصل ایک تبلیغی مذہب ہے جس نے اپنے آپ کو تبلیغ کی بنیادوں پر قائم کیا' اسی کی قوت سے ترقی کی' اور اسی پر اس کی زندگی کا انحصار ہے۔ اسلامی تعلیمات پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اگر کسی چیز کا نام ہے تو وہ صرف دعوت حق ہے اور مسلمان کی زندگی کا اگر کوئی مقصد ہے تو وہ صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن حکیم میں مسلمان کا مقصد حیات یہی بیان کیا گیا ہے کہ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (آل عمران ۳: ۱۰۴' ۱۱۰' النحل ۱۶:۱۲۵) دنیا کے لیے اس کے وجود کی ضرورت صرف یہی ظاہر کی گئی ہے' اور اسے جگہ جگہ یہی حکم دیا گیا ہے۔

یہی تعلیم تھی کہ جس کا اثر رسول اکرمؐ کی زندگی پر سب سے زیادہ غالب تھا' اور اسی نے حضرات صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کو بالکل بدل دیا تھا۔ ان کی مقدس زندگیاں عبارت تھیں صرف دعوت و تبلیغ سے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا' غرض ہر کام اپنے اندر یہ معنوی مقصد پوشیدہ رکھتا تھا کہ خدا کی طرف لوگوں کو بلائیں اور اللہ کے بندوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی تلقین کریں۔

جب تک مسلمانوں میں قرآن حکیم اور اسوہ رسولؐ کی ان تعلیمات کا اثر باقی رہا اس وقت تک ہر مسلمان کی زندگی ایک مبلغ اور داعی کی سی زندگی رہی۔ انھوں نے صنعت' تجارت' زراعت' حکومت اور دنیا کے سارے کام کیے' مگر دل میں یہ لگن رہی کہ اسلام کی جو نعمت خدا نے ان کو عطا کی ہے اس سے تمام بنی نوع انسان کو بہرہ مند کرنے کی کوشش کریں۔ وہ حقیقتاً اسلام کو دنیا کے لیے بہترین نعمت سمجھتے تھے اور اس لیے ان کا ایمان تھا کہ ہر انسان تک اس نعمت کو پہنچانا ان کا فرض ہے۔ جو شخص جس حال میں تھا اسی حال میں وہ یہ فرض انجام دیتا تھا۔ تاجروں نے تجارت کے کام میں' مسافروں نے اپنے سفر کے دوران میں' قیدیوں نے اپنے قید خانوں میں' ملازموں نے اپنے دفتروں میں اور مزارعوں نے اپنے کھیتوں میں یہ مقدس خدمت انجام دی۔ یہ ذوق اس حد تک ترقی کر گیا کہ عورتوں تک نے نہایت مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کی۔

اسلام کی قوت کا اصلی سرچشمہ

یہی ذوق حقیقتاً اسلام کی قوت کا اصلی سرچشمہ تھا۔ آج جو دنیا میں کروڑوں مسلمان نظر آ رہے ہیں' اور دنیا کی مختلف نسلوں' مختلف قوموں اور مختلف ملکوں پر اسلام کی حکومت قائم ہے' وہ صرف اسی ذوق تبلیغ

کا نتیجہ ہے۔

اسلام کے دشمن کہتے ہیں کہ اس کی اشاعت صرف تلواروں کی رہین منت ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ وہ صرف تبلیغ کی منت پذیر ہے۔ اگر اس کی زندگی تلوار پر ہی منحصر ہوتی تو وہ تلوار ہی سے فنا بھی ہو جاتی اور اب تک تلوار سے اس پر جتنے حملے ہوئے ہیں' وہ اسے فنا کر دینے میں قطعاً کامیاب ہو جاتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات اس نے تلوار سے مغلوب ہو کر تبلیغ سے فتح حاصل کی۔ ایک طرف بغداد میں قتل جاری تھا اور دوسری طرف ساٹرا میں اسلام کی حکومت قائم ہو رہی تھی۔ ایک طرف قرطبہ (اندلس) سے اسلام مٹایا جا رہا تھا اور دوسری طرف جاوا میں اس کا علم بلند ہو رہا تھا۔ ایک طرف صقلیہ سے اسے ختم کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف جاوا میں اس کو نئی زندگی حاصل ہو رہی تھی۔ ایک طرف تاتاری اس کے گلے پر چھری پھیر رہے تھے اور دوسری طرف وہ خود ان کے دلوں کو فتح کر رہا تھا۔ ایک طرف ترک اسے غلامی کا طوق پہنا رہے تھے اور دوسری طرف خود ان کے دل اپنے آپ کو اس کی غلامی کے لیے پیش کر رہے تھے۔

اگر یہ اس کی تبلیغ کی فتح نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ آج اسلام کی وہ فتوحات جنھیں شمشیری فتوحات کہا جا سکتا ہے' دنیا سے مٹ چکی ہیں۔ اسپین فنا ہو چکا' صقلیہ مٹ گیا' یونان تباہ ہو گیا مگر وسط افریقہ' جاوا' ساٹرا' اسپین اور جزائر ملایا جنھیں اس نے تبلیغ کے ہتھیار سے فتح کیا ہے' بدستور موجود ہیں اور اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام کی زندگی تبلیغ اور صرف تبلیغ پر منحصر ہے۔ پھر کیا یہ تبلیغ مشنری سوسائٹیوں کے ذریعے کی گئی تھی؟ کیا یہ عظیم الشان فتوحات اسی بے عمل چیخ پکار کے ذریعے حاصل ہوئی تھیں جس میں آج ہم مشغول ہیں؟ کیا یہ عالمگیریاں ان رسالہ بازیوں' ان کاغذی لڑائیوں اور ان قلمی ترکتازیوں کی منت کش ہیں جنھیں ہم نے مسیحی مبلغین کی تقلید میں اختیار کیا ہے۔ تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔

اشاعت اسلام کے اسباب

اگر واقعات و حقائق کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تین چیزیں لازمی عنصر کی حیثیت سے شریک ہیں:

ایک' اس کے سادہ عقائد اور دلکش عبادات۔

دوسرے' مسلمانوں کی زندگی میں اس کی تعلیم کے حیرت انگیز نتائج۔

اور تیسرے' مسلمانوں کا ذوق تبلیغ۔

پہلی چیز عقل سے اپیل کرتی ہے' دوسری جذبات کو ابھارتی ہے' اور تیسری ایک مشفق رہنما کی طرح بھولے بھٹکوں کو راہ راست پر لگاتی ہے۔ جس طرح بازار میں ایک متاع کی مقبولیت کے لیے صرف اس کی ذاتی خوبی ہی ضمانت نہیں ہوتی' بلکہ اس کے لیے ایسے کارکنوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو اس کی خوبیاں

اور فوائد لوگوں کے ذہن نشین کرائیں' اور ایسے شاہد بھی درکار ہوتے ہیں جو اپنے اندر اس کے منافع کی عملی شہادت دیں' اسی طرح دنیا میں اسلام کی اشاعت کے لیے بھی ان تینوں چیزوں کے مساویانہ اشتراک عمل کی ضرورت رہی ہے۔ اور جب کبھی اس میں کسی ایک کی کمی رہ گئی ہے تو ضرور اشاعت اسلام کی تیز رفتاری پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصل چیز تو وہی اسلام کی ذاتی خوبیاں اور عملی محاسن ہیں جو ہر قلب سلیم سے اس کو ایک سچا دین قبول کرا لیتی ہیں۔ اسلام خواہ کتنا ہی سچا اور بہتر مذہب ہو' مگر اس کی اشاعت کے لیے صرف اس کی ذاتی خوبیاں ہی کافی نہیں ہو سکتیں' بلکہ اس کے پیروؤں کا ذوق تبلیغ' بھی ضروری ہے' بلکہ زیادہ صحیح طور پر یہ ذوق تبلیغ' اشاعت اسلام کے ارکان ثلاثہ میں عملی رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔

مسلمانوں کے ذوق تبلیغ کی جہانگیری

آج ہم بے عمل مسلمان اس حیرت انگیز ذوق تبلیغ کا ٹھیک ٹھیک تصور بھی نہیں کر سکتے جو گذشتہ زمانے کے دیندار مسلمانوں میں کام کر رہا تھا۔ ان لوگوں کے وظائف حیات میں سب سے زیادہ اہم وظیفہ اگر کوئی تھا تو وہ صرف اس دین کی صداقت کو بنی نوع انسان کے زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچانا تھا جس کی روشنی سے ان کے دل معمور تھے۔ ان کے دلوں پر یہ عقیدہ پتھر کی لکیر بنا ہوا تھا کہ مسلمان کی حیثیت سے ان کی پیدائش کا مقصد صرف دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ وہ جہاں جاتے تھے یہ مقصد ان کے ساتھ جاتا تھا اور ان کی زندگی کے ہر عمل میں اس کی شرکت لازمی تھی۔ وہ قریش کے مظالم سے بھاگ کر حبشہ گئے تو وہاں بھی انھوں نے صرف یہی کام کیا۔ انھیں مکہ سے نکل کر مدینہ میں امن کی زندگی نصیب ہوئی تو اپنی تمام قوت انھوں نے اسی تبلیغ دین الٰہی میں صرف کر دی۔ ان کو ساسانی اور رومانی تہذیبوں کے بوسیدہ قصر گرا دینے کی خدمت عطا کی گئی تو شام و عراق اور ایران و روم میں بھی انھوں نے صرف یہی مقدس فرض انجام دیا۔

انھیں خدا نے زمین کی خلافت عطا فرمائی تو اس سے بھی انھوں نے عیش پرستی نہیں کی' بلکہ وہ اللہ کے دین کی اشاعت کرتے چلے گئے یہاں تک کہ ایک طرف اوقیانوس کی طوفانی موجوں نے انھیں روک دیا اور دوسری طرف چین کی سنگین دیوار ان کے راستے میں حائل ہو گئی۔ وہ اپنے تجارت کے مال لے کر نکلے تو اس میں بھی ان کے دلوں پر یہی خواہش چھائی رہی۔ انھوں نے افریقہ کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں' ہندستان کی سرسبز وادیوں میں' بحرالکاہل کے دور افتادہ جزیروں میں' اور یورپ کے سپید رنگ کفرزاروں میں ملت حنیفی کی روشنیوں کو پھیلا دیا۔

یہ ذوق تبلیغ یہاں تک ترقی کر گیا تھا کہ قید خانوں کی کڑی سے کڑی مصیبتیں جھیلتے وقت بھی ان کے

دلوں سے اس کی لذت محو نہیں ہوتی تھی۔ وہ اندھیری کوٹھڑیوں میں اپنے اصحاب سجن کو بھی اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ اور حد یہ ہے کہ دار پر بھی انھیں اگر کسی چیز کی تمنا ستاتی تھی تو وہ صرف یہی تھی کہ اپنے آخری لمحات زندگی کو اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں صرف کر دیں۔

بیلجین کانگو کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ جب حکومت بیلجیم نے وہاں کے ایک مسلمان امیر کو گرفتار کر کے سزائے موت کا حکم سنا دیا تو اس نے دنیا سے چلتے چلتے خود اس پادری کو بھی مسلمان کر لیا جو اسے مسیحیت کا پیغام نجات دینے گیا تھا۔ مشرقی یورپ میں تو اسلام کی اشاعت تنہا ایک مسلمان عالم کی کوششوں کا نتیجہ تھا جو نصاریٰ سے جہاد کرتا ہوا گرفتار ہو گیا تھا۔ قید کی حالت میں وہ پابہ زنجیر ڈان اور ڈینوب کے درمیانی علاقے میں بھیج دیا گیا اور وہاں اس کے خلوص قلب کی روشنی اس قدر پھیلی کہ تھوڑے عرصے میں بارہ ہزار آدمی مسلمان ہو گئے، اور چھٹی صدی ہجری کے وسط میں تقریباً سارا علاقہ اسلام کی برکات سے معمور ہو گیا۔

مسلمان خواتین کا ذوق تبلیغ

اس عالمگیر ذوق سے مسلمانوں کی عورتیں بھی خالی نہ تھیں۔ تاتاری مغلوں سے جن ہاتھوں نے مسلم کشی کی تلوار چھین کر اسلام کی اطاعت کا طوق پہنایا تھا وہ انھی ضعیف اور نازک عورتوں کے ہاتھ تھے جنھیں یہ لوگ ممالک اسلامیہ سے لونڈیاں بنا کر لے گئے تھے۔ غازان شاہ کے بھائی اولجاتیو خاں کو اس کی بیوی ہی نے مسلمان کیا تھا اور اس کی بدولت ایلخانی حکومت ایک اسلامی حکومت بن گئی تھی۔ چغتائی خاندان مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا مگر قرہ، ہلاکو خان کی مسلمان بیوی، نے اسے سب سے پہلے اسلام سے متعارف کیا، اور اسی کے اثر سے مبارک شاہ اور براق خاں مسلمان ہوئے۔ تاتاری فوجوں کے ہزارہا سپاہی اپنے ساتھ مسلمان عورتوں کو لے گئے تھے۔ انھوں نے اپنے مذہب کو چھوڑ کر اپنے کافر شوہروں کا مذہب اختیار کرنے کے بجائے انھیں، اور زیادہ تر ان کے بچوں کو، مسلمان کر لیا، اور انھی کی بدولت تمام بلاد تاتار میں اسلام پھیل گیا۔ اسی طرح ملک حبش میں بھی خواتین ہی نے اشاعت اسلام کا کام کیا ہے۔ چنانچہ متعدد ایسے حبشی رئیسوں کا تذکرہ تواریخ میں مذکور ہے جنھیں ان کی مسلمان بیویوں نے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا تھا۔ سنوسی مبلغین نے تو وسط افریقہ میں مستقل طور پر اشاعت اسلام کے لیے خواتین کے اداروں سے کام لیا ہے۔ چنانچہ وہاں سیکڑوں زنانہ مدارس قائم ہیں جن میں لڑکیوں کو اسلامی تعلیم دی جاتی ہے۔

صوفیائے کرام کی خدمات ہندستان میں

مگر مسلمانوں میں جو جماعت سب سے زیادہ تبلیغ دین الٰہی کے لیے ذوق و شوق سے گرم سعی رہی ہے وہ وہی صوفیائے کرام کی جماعت ہے جو آج ہندستان میں اس طرف سے تقریباً بالکل ہی غافل ہے۔ خود ہندستان میں اولیا و صوفیا نے جس بے نظیر استقلال اور دینی شغف کے ساتھ اسلام کی روشنیوں کو پھیلایا ہے

وہ ہمارے آج کل کے حضرات متصوفین کے لیے اپنے اندر ایک عمیق درس بصیرت رکھتا ہے۔

یہاں کے سب سے بڑے اسلامی مبلغ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ تھے جن کی برکت سے راجپوتانہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی، اور جن کے بالواسطہ اور بلاواسطہ مریدین تمام اقطاع ملک میں اسلام کی شمع ہدایت لے کر پھیل گئے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دہلی کے اطراف میں، حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے علاقہ پنجاب میں، حضرت نظام الدین محبوب الہیؒ نے دہلی اور اس کے نواح میں، حضرت سید محمد گیسو درازؒ، حضرت شیخ برہان الدینؒ اور حضرت شیخ زین الدینؒ اور آخر زمانے میں (اورنگ آباد) کے حضرت نظام الدینؒ نے ملک دکن میں، اور دور آخر میں حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ نے دہلی مرحوم میں یہی دعوت الی الخیر اور تبلیغ اوامر اسلام کی خدمت انجام دی۔

ان کے علاوہ دوسرے سلسلوں کے اولیائے عظام نے بھی اس کام میں انتھک مستعدی سے کام لیا۔ پنجاب بھر میں سب سے پہلے اسلامی مبلغ حضرت سید اسماعیل بخاریؒ تھے جو پانچویں صدی ہجری میں لاہور تشریف لائے تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ لوگ ہزارہا کی تعداد میں ان کے ارشادات سننے آتے تھے اور کوئی شخص جو ایک مرتبہ ان کا وعظ سن لیتا وہ اسلام لائے بغیر نہ رہتا۔ مغربی پنجاب میں اسلام کی اشاعت کا فخر سب سے زیادہ حضرت بہاء الحق زکریا ملتانیؒ کو حاصل ہے۔ علاقہ بہاولپور اور مشرقی سندھ میں حضرت سید جلال بخاریؒ کے فیضان تعلیم سے معرفت حق کی روشنی پھیلی۔ ان کی اولاد میں حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے پنجاب کے بیسیوں قبائل کو مسلمان کیا۔ ایک اور بزرگ حضرت سید صدر الدینؒ اور ان کے صاحبزادے حضرت حسن کبیرالدینؒ بھی پنجاب کے بہت بڑے اسلامی مبلغ تھے۔ حضرت حسن کبیرالدینؒ کے متعلق تواریخ میں لکھا ہے کہ ان کی شخصیت میں عجیب کشش تھی۔ محض ان کے دیکھ لینے سے دل پر اسلام کی عظمت و صداقت کا نقش مرتسم ہو جاتا تھا اور لوگ خود بخود ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

سندھ میں اشاعت اسلام کا اصلی زمانہ وہ ہے جب حکومت کا دور ختم ہو چکا تھا۔ آج سے تقریباً چھ سو برس پہلے حضرت سید یوسف الدینؒ وہاں تشریف لائے اور ان کے فیض اثر سے لوہانہ ذات کے سات سو خاندانوں نے اسلام قبول کر لیا۔ کچھ اور گجرات میں حضرت امام شاہ پیرانویؒ اور ملک عبداللطیفؒ کی مساعی سے اسلام کی اشاعت ہوئی۔ بنگال میں سب سے پہلے شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اس مقدس فرض کو انجام دیا جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مریدان خاص میں سے تھے۔ آسام میں اس نعمت عظمٰی کو حضرت شیخ جلال الدین فارسیؒ اپنے ساتھ لے گئے جو سلہٹ میں مدفون ہیں۔ کشمیر میں اسلام کا علم سب سے پہلے بلبل شاہؒ نامی ایک درویش نے بلند کیا اور ان کے فیض صحبت سے خود راجہ مسلمان ہو گیا جو تاریخوں میں صدر الدین کے نام سے مشہور ہے۔ پھر ساتویں صدی ہجری میں سید علی ہمدانیؒ سات سو سیدوں کے ساتھ

یہاں تشریف لائے اور تمام خطہ کشمیر میں اس مقدس جماعت نے نور عرفان کو پھیلایا۔ حضرت عالمگیرؒ کے عہد میں سید شاہ فرید الدینؒ نے کشتوار کے راجہ کو مسلمان کیا اور اس کے ذریعے علاقہ مذکور میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ دکن میں اسلام کی ابتدا پیر مہابیر کھمدایتؒ سے ہوئی جو آج سے سات سو برس پہلے بیجاپور تشریف لائے تھے۔ ایک اور بزرگ جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے علاقہ کونکن کے ہادی اور رہبر تھے۔ دھارواڑ کے لوگ اپنے اسلام کو حضرت شیخ ہاشم گجراتیؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں جو ابراہیم عادل شاہ کے پیر طریقت تھے۔ ناسک میں حضرت محمد صادق سرمستؒ اور خواجہ اخوند میر حسنیؒ کی برکات روحانی کا اب تک اعتراف کیا جاتا ہے۔ مدراس بھی اپنی ہدایت کے لیے چند صاحب حال بزرگوں کا رہین منت ہے جن میں سب سے زیادہ مشہور سید نثار شاہؒ مدفون ترچناپلی ہیں۔ دوسرے بزرگ سید ابراہیم شہیدؒ ہیں جن کا مزار ارداری میں ہے۔ اور تیسرے بزرگ شاہ الحامدؒ ہیں جن کا مدفن ناگور میں واقع ہے۔ نیوگنڈا کی طرف کی اسلامی آبادی عام طور پر اسلام کو حضرت بابا فریدالدینؒ کی طرف منسوب کرتی ہے جنھوں نے وہاں کے راجہ کو مسلمان کیا تھا۔

حضرات صوفیائے کرام کی انھی تبلیغی سرگرمیوں کا اثر آج تک ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی ایک بہت بڑی جماعت اگرچہ مسلمان نہ ہو سکی مگر اب تک اسلامی پیشواؤں کی گرویدہ ہے۔ چنانچہ ۱۸۹۱ کی مردم شماری میں صوبہ شمال مغربی (موجودہ صوبہ متحدہ) کے ۲۴۲۳۶۴۳ ہندوؤں نے اپنے آپ کو کسی خاص دیوتا کا پرستار بتلانے کے بجائے کسی نہ کسی مسلمان پیر کا پجاری ظاہر کیا تھا۔ افسوس کہ وہ لوگ ہندوؤں کی ایک کثیر آبادی پر اسلام کا غیر معمولی اثر چھوڑ گئے مگر آج ہم اس اثر سے بھی فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔

ہندستان سے باہر

ہندستان سے باہر بعض دوسرے ممالک میں بھی اس مقدس جماعت کی تبلیغی سرگرمیوں نے حیرت انگیز نتائج پیدا کیے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ قرون متوسط کی تاریخ میں تو یہ واقعہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب فتنہ تاتار نے اسلامی حکومت کے قصر فلک بوس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، تو تمام وسط ایشیا میں صرف ایک صوفیائے اسلام کی روحانی قوت تھی جو اس کے مقابلے کے لیے باقی رہ گئی تھی، اور بالآخر اسی نے اسلام کے اس سب سے بڑے دشمن پر فتح حاصل کی۔ لیکن مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ زبردست قوت بھی جس نے اقطاع عالم میں اسلام کی روشنی پھیلائی اور تاتار کے زبردست فتنے تک کو اس کے لیے مسخر کر دیا جو قریب تھا کہ وسط ایشیا سے اس کو بالکل فنا کر دیتا، آج بالکل مضمحل ہو گئی ہے۔ اگر ہمارے محترم حضرات متصوفین ہمیں معاف کریں تو ہمیں اس امر واقعی کے اظہار میں بھی کچھ تامل نہیں ہے کہ اب وہ اسلام کی برکات و فیوض سے دنیا کو معمور کرنے کے بجائے بہت حد تک خود ہی غیر اسلامی مفاسد

سے مغلوب ہو کر رہ گئے ہیں۔

افریقہ میں

موجودہ عہد (۱۹۲۵) میں یہ قوت صرف افریقہ میں زندہ ہے اور تبلیغ دین الٰہی کے سلسلے میں اس کی عظیم الشان کامیابیاں ہمارے ملک کے صوفیائے کرام کے لیے سرمایہ عبرت و بصیرت ہیں۔

ان صوفی جماعتوں میں ایک "جماعت امیر غنیہ" ہے جس کے بانی محمد عثمان الامیر غنی نے ۱۸۳۵ سے ۱۸۵۳ تک مشرقی سوڈان کے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی اور اطراف میں بیسیوں بت پرست قبائل کو مسلمان کر لیا۔

دوسری جماعت قادریہ ہے۔ مغربی افریقہ میں اس سلسلے کے لوگ نویں صدی ہجری سے موجود ہیں۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں ان کے اندر بھی ایک نئی زندگی پیدا ہوئی اور انھوں نے مغربی سوڈان سے لے کر ٹمبکٹو اور سینیگال تک اپنے حلقے قائم کر لیے۔ خصوصیت کے ساتھ ناگا، ٹیمبو اور مساردو میں انھوں نے بہت بڑے حلقے قائم کر لیے اور نہایت کثرت سے بت پرست قبائل میں اسلام کی اشاعت شروع کر دی۔ ان کا اصول یہ ہے کہ جب کسی آبادی میں اسلام کی اشاعت کر چکتے ہیں تو وہاں کے ذہین اور صاحب استعداد لڑکوں کو اپنے مرکزی حلقوں میں تعلیم کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ یا اگر ان میں زیادہ صلاحیت دیکھتے ہیں تو علوم دینی کی تکمیل کے لیے قیروان، فاس، طرابلس یا الازہر (مصر) بھیج دیتے ہیں اور پھر واپسی پر انھی کو اپنی بستیوں میں تبلیغ و تعلیم کے لیے مقرر کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے نہایت کثرت سے اندرون افریقہ میں مدارس قائم کر رکھے ہیں اور ان میں صحیح اصولوں پر وحشی قبائل کے لڑکوں کی تربیت کرتے ہیں۔

ایک اور سلسلہ "تیجانیہ" کے نام سے مشہور ہے جو سب سے پہلے الجزائر میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے اصول تبلیغ تقریباً وہی ہیں جو سلسلہ قادریہ کے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ وہ تبلیغ کے ساتھ جہاد بھی کرتا ہے اور اس لیے عیسائی مشنریوں کو اس کے خلاف یورپی استعمار سے مدد حاصل کرنے کا اچھا خاصا بہانہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس کا حلقہ اثر شمالی افریقہ کا مغربی حصہ ہے اور اس کا سب سے زیادہ سرگرم داعی، الحاج عمر تھا جو اپنے زہد و تقویٰ کے لیے افریقہ سے حجاز تک شہرت رکھتا تھا۔ اس نے ۱۸۳۳ میں تبلیغ کا کام شروع کیا اور بالائی نائیجیریا اور سینیگال تک کے بت پرست قبائل کو مسلمان کر کے ایک زبردست سلطنت قائم کر لی، جسے آخر میں فرانسیسی استعمار نے پیوند خاک کر دیا۔

ان تمام جماعتوں میں سب سے زیادہ زبردست سنوسی جماعت ہے۔ ۱۸۳۳ میں الجزائر کے ایک مشہور عالم سیدی محمد بن علی السنوسی نے طریقہ سنوسیہ کی ابتدا کی، جس کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح، فرنگی استعمار کی مدافعت اور اسلام کی اشاعت تھا۔ بائیس سال کے عرصے میں انھوں نے ایک ایسی زبردست جماعت تیار کر لی جس کا نظام سلطنتوں کے نظام سے زیادہ مکمل تھا۔ جس کا ہر شخص جماعتی مقصد کی لگن میں ڈوبا ہوا تھا اور جس کے ہر رکن کو خالص اسلامی تربیت دے کر سچا مسلمان بنا دیا گیا تھا۔ اس میں قرآن مجید کے لفظ لفظ

پر عمل کرنا پہلی شرط ہے۔ اولیا کی پرستش' مزارات کی زیارت' کافی اور تمباکو کا استعمال' یہودیوں اور عیسائیوں سے تعلقات سب ممنوع ہیں اور ہر شخص ایک سچے مجاہد کی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ مصر سے لے کر مراکش تک اور ساحل طرابلس سے لے کر صحرائے افریقہ کے آخری کونوں تک اس کی خانقاہیں قائم ہیں اور افریقہ کے علاوہ عرب' عراق اور جزائر ملایا تک اس کا اثر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی تبلیغی کوششوں نے افریقہ کے ان تمام قبائل کو صحیح معنوں میں مسلمان بنا دیا ہے جو صرف برائے نام مسلمان رہ گئے تھے اور گالا' تبستی اور بورکو کے علاقوں تک اسلام کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ قادریہ سلسلے کے لوگوں کی طرح ان کے ہاں بھی صرف وعظ و تلقین نہیں ہے بلکہ یہ مسلمان بنانے کے بعد نومسلموں کو عملی تربیت دیتے ہیں تاکہ وہ خود اپنے ہم جنسوں کو اسلام کی طرف راغب کر سکیں اور دعوت الی الخیر کا کام بخوبی انجام دے سکیں۔

دعوت عمل

یہ داستان سرائی محض اس لیے نہیں کہ اس سے کچھ افسانہ ہائے پارینہ کو چھیڑنا مقصود ہے۔ بلکہ اس سے دراصل ہم یہ بتانا چاہتے تھے کہ اسلام کی دینی اور دنیاوی قوت کا اصلی سرچشمہ وہی دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے جس پر اس کی ساری زندگی کی بنیاد رکھی گئی تھی' اور جس کے لیے مسلم نام کی ایک قوم کو حضرت حق جل شانہ نے پیدا کیا تھا' اور چونکہ پیغام کی فطرت اس بات کو چاہتی ہے کہ اسے مرسل الیہ تک پہنچایا جائے اس لیے تبلیغ خود اسلام کی فطرت میں شامل ہے۔

اس ماموریت کے احساس نے اسلام کی تیرہ سو سالہ زندگی میں جو حیرت انگیز کرشمے دکھائے ہیں ان کا ایک نہایت مختصر سا خاکہ پیش کیا جا چکا ہے۔ افریقہ کے وسیع براعظم میں بغیر کسی جبر و لالچ اور مکر و دغا کے جس طرح کروڑوں آدمی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے' چین میں بغیر کسی مادی اور جباری قوت کے جس طرح آبادیوں کی آبادیاں اسلام کی تابع فرمان بن گئیں' جزائر ملایا میں نہتے اور بے زور تاجروں کے ہاتھوں جس طرح ۸۰ فیصد آبادی خدائے واحد کی پرستار بن گئی' تاتارستان کے مسلم کش اور خونخوار وحشیوں کو ضعیف اور نازک عورتوں اور بے نوا درویشوں نے جس طرح اسلام کے آستانہ رحمت پر لا کر جھکا دیا' اس کی بصیرت افروز داستان ہم نے اسی احساس کے کرشمے دکھانے کے لیے اپنے برادران ملت کے سامنے پیش کی ہے' اور اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ان میں بھی کسی طرح یہ احساس جاگ اٹھے۔

محض تبلیغی جماعتیں یا ہمہ گیر ذوق تبلیغ؟

ہم نے جگہ جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں نے عیسائیوں کی طرح مشنری سوسائٹیاں بنا کر کام نہیں کیا۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم تنظیم کے ساتھ کام کرنے کے مخالف ہیں' بلکہ دراصل مراد یہ ہے کہ یہ کام محض ایک جماعت یا چند جماعتوں کا نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے مسلمانوں میں تبلیغ دین کے ایک ایسے عام ذوق کی ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اپنے آپ کو اس مقدس کام کے لیے مامور سمجھنے لگے۔

اگر عام مسلمان اس ذوق سے بے بہرہ رہیں اور محض ایک انجمن یا چند انجمنوں پر یہ کام چھوڑ دیا جائے تو ہم کبھی غیر مسلموں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر جگہ مسلمانوں کا عام ذوق تبلیغ ہی فتح و کامرانی سے سرفراز ہوا ہے۔ اگر افریقہ میں مسلمانوں کا یہ عام ذوق نہ ہوتا اور صرف چند انجمنیں ہی فریضہ تبلیغ کو انجام دینے کے لیے چھوڑ دی جاتیں تو عیسائیوں کی بدرجہا زیادہ طاقتور اور دولت مند سوسائٹیوں کے مقابلے میں انھیں قیامت تک وہ کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی تھی جس پر آج ساری مسیحی دنیا انگشت بدنداں رہ گئی ہے۔ اسی طرح اگر مجمع الجزائر ملایا میں عام تاجروں اور سیاحوں کا جذبہ خدمت دینی کام نہ کرتا اور صرف وہ چند عربی اور ہندی واعظین اور علما ہی دعوت اسلام کا فرض انجام دیتے جو وقتاً فوقتاً وہاں پہنچتے رہے تھے تو شاید آج بحرالکاہل کے ساحلوں پر اذان کی وہ گونج اس کثرت سے سنائی نہ دیتی جو آج بت پرستی اور مسیحی استعمار کی متحدہ مزاحمت کے باوجود سنائی دے رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دعوت اسلام ایک فرض کفایہ ہے جس کے لیے کسی ایک جماعت کا کھڑا ہونا تمام امت کے لیے کفایت کرتا ہے لیکن شریعت کی یہ رخصت محض مسلمانوں کی آسانی کے لیے ہے۔ اس رخصت کا مطلب اگر کچھ ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ یہ فرض عائد تو تمام مسلمانوں پر ہوتا ہے' جسے سب کو ادا کرنا چاہیے' لیکن کم از کم ایک جماعت تو ایسی ضرور رہنی چاہیے جو ہمیشہ بالالتزام اسے ادا کرتی رہے اور وہ جماعت یقیناً علما و صلحائے امت کی جماعت ہے۔

حرف آخر

ضرورت ہے کہ ہمارے علما اور سجادہ نشین حضرات اپنے حجروں سے نکلیں۔ علما کا فرض تو ظاہر ہے کہ انھیں ورجہ "خشیت" اور انبیاے بنی اسرائیل سے مشابہت جیسی فضیلتیں کچھ مفت ہی نہیں مل گئی ہیں' بلکہ ان پر امت کی اصلاح و ہدایت کا ایک بہت بڑا بار رکھ دیا گیا ہے' جسے اٹھانے میں ذرہ برابر بھی کوتاہی کرنے پر وہ خدا کی شدید گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ مگر ہم حضرات صوفیائے کرام کو بھی ان کا فرض یاد دلانا چاہتے ہیں۔ جن سجادہ ہاے طریقت پر وہ جلوہ فرما ہیں وہ ارشاد و ہدایت کی مسندیں ہیں۔ ان کی وراثت اپنے ساتھ چند فضیلتیں اور دنیاوی فوائد ہی نہیں رکھتی' بلکہ وہ بہت سی ذمہ داریاں اور بہت سی مسؤلیتیں بھی رکھتی ہے' جن کے احساس نے قدماے متصوفین کو اسلام کی خدمت کے سوا اور کسی مطلب ہی کا نہ رکھا تھا۔ آج اگر یہ حضرات ان ذمہ داریوں کو محسوس کر لیں جو ایک مسلمان سے بیعت لینے کے بعد اس کی اصلاح و تزکیہ نفس کے لیے ان پر عائد ہوتی ہیں تو مسلمانوں کے سیکڑوں مصائب کا علاج ہو سکتا ہے۔ بڑے بڑے سجادہ نشینوں اور پیران طریقت کا حلقہ ارادت کم از کم کروڑ ڈیڑھ کروڑ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اس میں ان کو ایسا زبردست اثر حاصل ہے کہ وہ اپنے ایک اشارے سے ان کی زندگیوں کا نظام بدل سکتے ہیں۔ ایسی کثیر جماعت میں اسلامی خدمت کا جوش پیدا کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ چند ہی سال میں اس سرزمین کا نقشہ بدل جائے۔ تو کیا ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ یہ حضرات اپنے کاشانہ امن و عافیت سے نکل کر اس نازک وقت میں کچھ خدا اور اس کے دین حق کے لیے بھی دوڑ دھوپ کریں گے؟ (تلخیص و تدوین: خرم مراد)

اپنی تربیت کیسے کریں۔ ۳

اپنا ارادہ اور عمل شرط ہے

خرم مراد

(تربیت کے موضوع پر زیر تحریر کتاب کا ایک اور باب)

دنیا میں کامیابیاں ہوں' یا آخرت کی کامرانیاں' دونوں کے لیے اپنی تربیت ناگزیر ہے۔ جنت اپنی تربیت اور تزکیے کے بغیر نہیں مل سکتی۔ اپنی تربیت کرنے اور جنت میں جانے کا یہ راستہ آسان ہے' اور یہ بالکل تمھارے بس اور اختیار میں ہے کہ اپنی تربیت کر سکو' کرو' اور کر لو۔

لیکن اب یہ بات بھی ـــــ دوسری بات ـــــ ہمیشہ خوب اچھی طرح یاد رکھو کہ تمھاری تربیت صرف تمھارے اپنے کرنے ہی سے ہو سکتی ہے۔ جو کچھ کرنا ضروری ہے' تم اس کا ارادہ کرو' اسے کرنے کی کوشش کرو' عمل کرو ـــــ اس کے بغیر تمھاری تربیت کسی طرح ممکن نہیں۔

تمھارا ارادہ اور تمھارا عمل ـــــ اپنے بس بھر عمل کی پوری کوشش ـــــ یہی تمھاری تربیت کے لیے پہلی شرط ہے۔ بس یہی چیز اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے' بس اسی پر انھوں نے اپنے سارے انعام و اکرام کا وعدہ کیا ہے۔

تم ارادہ نہ کرو' تربیت کے لیے جو کچھ کرنا تمھاری ذمہ داری ہے' اس کے مطابق عمل نہ کرو' تو اس کا کوئی بدل نہیں' اس کی تلافی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ کوئی چیز تمھارے ارادے اور عمل کی جگہ نہیں لے سکتی۔ کوئی تمھاری جگہ وہ کام نہیں کر سکتا جس کو کرنے کے لیے ذمے داری تمھیں دی گئی ہے۔ تم کچھ سیکھ کر اس پر عمل نہ کرو' یا سیکھنا ہی نہ چاہو' تو کوئی تعلیم و تربیت تمھیں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی۔ اپنے ایمان اور عمل کے علاوہ کوئی چیز نہیں جو تمھیں اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت کا مستحق بنا سکے' تمھیں جنت میں لے جا سکے۔

یہی تربیت کا اصل اصول ہے۔ یہ بالکل ظاہر اور روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اتنا بدیہی ہونے کے باوجود' بدقسمتی سے یہی اصول سب سے زیادہ نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے' یا ہو جاتا ہے۔ بے شمار تمناؤں اور تاویلات کے پردوں میں چھپ جاتا ہے۔ اس کو بھول کر ہم دسیوں سہاروں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں' مگر کوئی بھی سہارا سراب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

تخلیق و امتحان کا تقاضا: عمل کے بدلے کا قانون

غور کرو تو تربیت کا یہ قطعی اور واضح اصول ہمارے مقصد وجود میں مضمر ہے۔ یہ اس امتحان کی بنیاد اور روح ہے' اس کا ناگزیر تقاضا ہے' جس کی خاطر ہمیں پیدا کیا گیا ہے۔ ہمیں حسن عمل کے امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ اسی امتحان کے لیے ہم کو اپنے عمل پر اختیار دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے عمل کے علاوہ ہمیں کسی چیز پر بھی کوئی حقیقی اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ اختیار عمل ہی کا تقاضا ہے کہ تربیت کا عمل آسان ہے' اس لیے کہ عمل ہمارے اختیار میں ہے۔ لیکن اسی اختیار اور حسن عمل کے امتحان کا لازمی تقاضا یہ بھی ہوا کہ ہمیں جو کچھ ملے وہ صرف ہمارے ارادہ کرنے اور عمل کرنے کے بدلے میں ملے۔ اللہ کی رحمت ملے تو اسی کے بدلے میں' مغفرت ملے تو اسی کے بدلے میں' اور اس مغفرت و رحمت کی بدولت جنت ملے تو وہ بھی اسی کے بدلے میں۔

اگر ہمارے لیے یہ امکان اور راستہ بھی کھلا ہوتا کہ --- ہم نہ چاہیں' ارادہ نہ کریں' عمل نہ کریں --- پھر بھی کسی اور کے وہ عمل کرنے سے جو ہمارے کرنے کا ہے' کسی کی تعلیم و تربیت سے' کسی کے حکم و اختیار سے ہمارے لیے تربیت اور جنت کی راہ ہموار ہو جاتی تو وہ امتحان ہی بے معنی اور باطل ہو جاتا جس کی خاطر ہمیں پیدا کیا گیا ہے۔

کوئی بھی ہماری جگہ وہ نماز نہیں پڑھ سکتا جو ہمیں پڑھنا ہے۔ وہ روزہ نہیں رکھ سکتا' وہ وعدہ پورا نہیں کر سکتا' مخلوق کی وہ خدمت نہیں کر سکتا' وہ جہاد نہیں کر سکتا' جو کرنا ہمارا کام ہے۔ اور اگر کوئی دوسرا وہ عمل کرے جو ہمیں کرنا ہے --- اس طرح کہ اس میں ہمارا سرے سے کوئی دخل ہی نہ ہو تو --- اس پر عذاب ثواب کے مستحق ہم کیسے ہو سکتے ہیں۔ کوئی ہمیں مجبور کر کے کوئی گناہ کرائے' اور اس میں ہماری خواہش و ارادے کو دخل نہ ہو' تو اس کا وبال ہم پر نہیں۔ **من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان** (اس پر کوئی غضب نہیں' جس پر زبردستی کی گئی ہو (کہ وہ کفر کرے) جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔ اسی طرح کوئی ہم سے اس طرح نیکی کرا لے کہ ہم کرنا نہ چاہتے ہوں' تو اس کا اجر ہمیں کیوں ملنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ پھر کوئی دوسرا ہماری جگہ تربیت کی وہ کوشش کیوں کر کر سکتا ہے' جس کا کرنا ہمارے ہی لیے مقرر کیا گیا ہے۔ یا اگر ہم خود اپنی تربیت کے لیے سعی نہ کریں' تو کسی کی بھی تعلیم و تربیت سے ہمیں فائدہ کیوں

کر پہنچ سکتا ہے۔ خارج سے تربیت کی ہر کوشش ایک بارش کی مانند ہے۔ چٹان پر سے وہ بارش بہہ جاتی ہے' ہر تالاب' ندی' نالہ' دریا اپنے ظرف کے مطابق اس کو حاصل کرتا ہے' ہر زمین اپنی استعداد کے مطابق فصل اگاتی ہے:

یہ اہم ترین بنیادی اصول اللہ تعالیٰ نے یوں بیان کر دیا ہے:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ' (البقرہ ۲:۲۸۶)

انسان جو نیکی خود کمائے' اسی کا پھل اس کے لیے ہے اور جو بدی خود سمیٹے اسی کا وبال اسی پر ہے' اور صرف اسی کو ملے گا۔

۲ پھر اسی اصل اصول کو بڑے اہتمام سے یوں بیان کرتے ہیں' اور اس تاکید کے ساتھ کہ یہ تو وہ اصول ہے جو ازل سے آسمانی صحیفوں میں لکھا چلا آ رہا ہے۔

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِىْ صُحُفِ مُوْسٰى - وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰى - اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى - وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى - وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى - ثُمَّ يُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى (النجم ۵۳:۳۶-۴۱)

کیا (انسان) کو وہ بات بتا نہیں دی گئی ہے جو موسیٰؑ کے صحیفوں اور اس ابراہیمؑ کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہے جس نے وفا کا حق ادا کر دیا؟ یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا' اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ عمل جس کی اس نے سعی کی' اور یہ کہ اس کا عمل اسے عنقریب ضرور دکھایا جائے گا' پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

پھر جنت کا حصول ---- جو حسن عمل کی آزمایش میں کامیابی کا انعام ہے---- عمل' کوشش' محنت' اور سعی کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے' اتنی وضاحت اور اتنی کثرت کے ساتھ کہ کسی غلط فہمی کے شائبہ کی بھی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ جنت کے راستے پر چلنے کے لیے تربیت' عمل کے علاوہ بھی کسی اور طرح ممکن ہے۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ' اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (بدلہ اس کا جو کرتے تھے)' لِلْمُتَّقِيْنَ (جنت تقویٰ رکھنے والوں کے لیے ہے)' اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (ان کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے)' دوڑو جنت کی طرف' مسابقت کرو جنت کی طرف' جنت جیسی چیز ہی کے لیے تو عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے' دوسروں پر بازی لے جانے والوں کو بازی لے جانا چاہیے: یہ وہ لہر ہے جو قرآن میں ہر جگہ موج زن ہے۔

صرف خواہش و تمنا سے' کسی کی نظر اور توجہ کی برکت سے' کسی تقریر و درس کی تاثیر سے' کسی کامل کی صحبت سے' جنت نہیں مل سکتی' اپنی وہ تربیت بھی نہیں ہو سکتی جس کا انعام جنت ہے---- جب تک اپنا

ارادہ نہ ہو' اپنی کوشش نہ ہو۔

کوئی چیز فائدہ نہ دے گی

تم سمجھتے ہو کہ تم ارادہ نہ کرو گے' کوشش نہ کرو گے' انگلی نہ ہلاؤ گے' جب بھی تمھاری تربیت ہو جائے گی۔ نہیں ہو گی۔ تم سمجھتے ہو کہ صرف کتابوں کا مطالعہ کر لو گے' اسٹڈی سرکل میں شرکت کر لو گے' اور تمھاری تربیت ہو جائے گی' نہیں ہو گی۔ ایک دل گداز درس سن لو گے' ایک جذبات انگیز تقریر کانوں میں پڑ جائے گی' ایک تربیتی پروگرام میں شرکت کر لو گے اور تمھاری تربیت ہو جائے گی۔ نہیں ہو گی۔ کسی مرد کامل کی صحبت' نظر' توجہ میسر ہو جائے گی' وہ انگلی پکڑ لے گا اور تمھارا بیڑا پار ہو جائے گا۔ یہ بھی نہیں ہو گا۔ جب تک تم خود نہ چاہو گے' ارادہ نہ کرو گے اور عمل کے راستے پر قدم نہ بڑھاؤ گے' تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ اگر تمھارے بغیر یہ سب کچھ ہو سکتا' اس کے باوجود کہ تم اپنے اختیار سے حسن عمل کرتے' تو امتحان اور جزا و سزا کا نظام بے معنی ہو جاتا۔

اگر تم خود نیک بننے کا ارادہ اور کوشش نہ کرو' تو نبیؐ کی تعلیم' توجہ اور صحبت بھی تمھیں نیک نہیں بنا سکتی' بد بننے سے نہیں روک سکتی۔ انبیا کو بھی کوئی اختیار ایسا نہیں دیا گیا جو تمھارے اختیار سے بالاتر ہو اور اس پر حاوی ہو سکے۔ اِنَّکَ لَا تَھۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ (القصص ۲۸:۵۶) اے نبیؐ' تم جسے چاہو ہدایت نہیں دے سکتے۔ آپؐ کو یہ اختیار نہیں بخشا گیا تھا' نہ یہ ذمہ داری دی گئی تھی' کہ کسی کو' اس کی مرضی کے خلاف' زبردستی ہدایت کے راستے پر چلا دیں۔ لوگ نفاق و کفر لے کر صحبت نبویؐ میں جا کر بیٹھتے تھے' اور گندگیوں کے ساتھ اسی طرح اٹھ کر چلے آتے تھے۔ وَقَدۡ دَّخَلُوۡا بِالۡکُفۡرِ وَھُمۡ قَدۡ خَرَجُوۡا بِہٖ (المائدہ ۵:۶۱) حالانکہ کفر لیے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لیے ہوئے واپس گئے۔ انھیں کوئی نفع نہ ہوتا' ان کی کوئی صفائی نہ ہوتی۔

شیطان کا زور

اگر تم خود بد نہ بنو' تو شیطان کی صحبت بھی تمھیں بد نہیں بنا سکتی' اگرچہ شیطان کی صحبت میں تو تم ہر وقت رہتے ہو۔ وہ تمھاری جان کے ساتھ لگا ہوا ہے' خون کے ساتھ گردش کر رہا ہے' ایسی جگہوں سے تمھاری تاک میں ہے جن کا تم کو پتا ہی نہیں' دائیں بائیں آگے پیچھے سے مسلسل نقب لگاتا رہتا ہے۔ لیکن وہ بھی تمھارے ارادے کے خلاف زبردستی تم سے کوئی عمل بد نہیں کرا سکتا۔ اسے کوئی ایسا اختیار تم پر نہیں دیا گیا ہے۔ وہ اپنے عمل پر تمھارے اپنے اختیار کو باطل نہیں کر سکتا۔ بلکہ روز قیامت تو وہ کھڑے ہو کر صاف کہہ دے گا "میرا تم پر کوئی زور اور اختیار تو تھا نہیں' میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو' اپنے آپ ہی کو ملامت کرو (ابراھیم ۱۴:۲۲)

توفیق الٰہی کی دست گیری

توفیق الٰہی کے بغیر تم کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن یاد رکھو کہ توفیق الٰہی بھی اسی وقت تمہارے شامل حال ہو گی اور تمہاری دست گیری کرے گی جب تم خود ارادہ کرو گے اور جنت کے راستے پر قدم آگے بڑھاؤ گے۔ اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں رہنے دیا گیا ہے:

وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (الشوریٰ ۴۲:۱۳) اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا (الفرقان ۲۵:۷۱) جو شخص توبہ کر کے نیک عملی اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسے کہ پلٹنے کا حق ہے۔

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى (طٰہٰ ۲۰:۸۲) البتہ جو توبہ کر لے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھا چلتا رہے اس کے لیے میں بہت درگزر کرنے والا ہوں۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ ۲:۱۵۲) تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔

اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (البقرہ ۲:۴۰) میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا، اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا، اسے میں پورا کروں، لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراھیم ۱۴:۷) اگر شکرگزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا۔

گویا تم ارادہ اور عمل کرو گے، تو ساری بشارتیں اور وعدے اس کے ساتھ مشروط ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک پیاری حدیث میں فرماتے ہیں کہ بندہ فرائض ادا کرتا ہے اور یہ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب ہے، پھر وہ دوڑ دوڑ کر وہ کام بھی کرتا ہے جو اللہ نے فرض نہیں کیے مگر اسے محبوب ہیں۔ جب بندہ یہ روش اختیار کرتا ہے تو اس کی نگاہ، سماعت، ہاتھ پاؤں سب اللہ کی مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ لیکن فرائض و نوافل کی ادائیگی تو بہرحال بندے کا کام ہے۔ وہ یہ نہ کرے تو یہ بشارت کیسے نصیب ہو گی۔ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں کہ جو اللہ کی طرف ایک بالشت آگے بڑھتا ہے، اللہ اس کی طرف ایک ہاتھ آگے بڑھتے ہیں، یہاں تک کہ جو چلتا ہوا آتا ہے اللہ اس کی طرف دوڑتے ہوئے آتے ہیں۔ تربیت اور جنت کی طرف راہنمائی کے لیے یہ بے پایاں رحمت دیکھو۔ لیکن یہ رحمت بھی اسی کے لیے ہے جو اپنے ارادے اور کوشش سے ایک بالشت تو بڑھے، ایک قدم تو اٹھائے۔ جو کھڑا ہی رہے، لاپرواہ اور بے نیاز رہے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے رکھے —— وہ اس بے پایاں رحمت سے کیا پائے گا۔ شرط تو بندہ کی طرف سے ارادہ اور کوشش کی ہے، باقی تو انتہائی فیاضی کے ساتھ میزبانی اور دوست گیری کا ہر سامان موجود ہے۔

بس ارادہ اور سعی ہی مطلوب ہے

جہاں اس غلط فہمی کی جڑ کاٹ دینا چاہیے کہ تمھارے ارادے اور عمل کے بغیر بھی تمھاری تربیت کا کوئی راستہ ہو سکتا ہے' وہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو نہ عمل میں کمال مطلوب ہے' نہ عمل کی تکمیل مطلوب ہے' نہ عمل میں کامیابی مطلوب ہے--- اس لیے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی تمھارے اختیار میں نہیں ہے۔ بلکہ صرف عمل کے لیے اپنی مقدور بھر کوشش اور سعی مطلوب ہے' جو تمھارے اختیار میں ہے۔ ساری کامیابی' قدر دانی اور اجر و انعام صرف اسی سعی پر عطا کرنے کا وعدہ ہے:

مَن اراد الاخرة وسعی لھا سعیھا وھو مومن فاولٓئک کَانَ سَعیُھم مَشکُورا(بنی اسرائیل ۱۹:۱۷)

جس نے آخرت (میں کامیابی) کا ارادہ کر لیا' اور اس کے لیے وہ کوشش کی جو کوشش اس کے لیے کرنا چاہیے--- اور وہ صاحب ایمان ہے--- ایسے لوگوں کی کوشش کو پوری قبولیت و قدر دانی سے نوازا جائے گا۔

یہ آیت' جو قرآن و سنت کی بے شمار تعلیمات پر مشتمل ہے' تربیت کے لیے عمل اور کوشش کے راستے کے بہت سارے فتنوں کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ کبھی تم کو یہ پریشانی لاحق ہو جاتی ہے کہ میرا عمل معیار مطلوب سے بہت نیچے ہے' اس میں بہت نقائص اور کمزوریاں ہیں' یہ بھلا کیسے قبول ہو گا۔ کبھی تم کو یہ فکر ہوتی ہے کہ عمل تو ہے لیکن کیفیات نہیں۔ نماز میں خشوع نہیں' دل میں رقت نہیں' آنکھوں میں نمی نہیں۔ کبھی تشویش ہوتی ہے کہ عمل تو ہے لیکن مطلوب نتائج نظر نہیں آتے۔ نماز پڑھتے ہیں' لیکن فحشا و منکر نہیں چھوٹتے۔ روزہ رکھتے ہیں' مگر تقویٰ حاصل نہیں ہوتا۔ کبھی یہ مایوسی لگ جاتی ہے کہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ دعوت دیتے ہیں' کوشش کر رہے ہیں' قربانیاں دے رہے ہیں۔ لوگ مانتے نہیں' دین غالب نہیں ہوتا' اسلامی ریاست قائم نہیں ہوتی۔ پھر ارادوں کا ضعف' تربیت کی ساری کوششوں کے باوجود بے قابو نفس! بار بار مایوسی ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ یاد رہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی--- جن کی فکر پریشان و مایوس کرتی ہے' اور بالآخر عمل ہی ترک کر دینے کے مقام پر پہنچا دیتی ہے--- تربیت میں کامیابی کے لیے' جنت میں جانے کے لیے شرط نہیں' مطلوب نہیں' تو نہ صرف پریشانی اور مایوسی قابو میں آ جائے گی' بلکہ تم کبھی تباہی کے اس کنارے پر نہیں پہنچو گے کہ کوشش اور عمل ہی ترک کر دو۔

ارادہ

ارادے کا ذکر ہم نے بار بار کیا ہے' قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تمھارے اختیار میں ہے۔ یہ تربیت کے لیے شرط ہے۔ یہ تربیت کے لیے بنیادی قوت ہے۔ ارادہ کیا ہے؟

ارادہ محض خواہش کا نام نہیں۔ یہ غلط فہمی بہت عام ہے۔ کہا جاتا ہے: "میں تو بہت چاہتا ہوں کہ فجر

کے وقت آنکھ کھل جائے اور نماز وقت پر پڑھ لوں۔ مگر آنکھ ہی نہیں کھلتی"۔ یہ "چاہنا" وقت پر اٹھ کر نماز پڑھنے کے "ارادے" کے مترادف نہیں۔ ذرا سوچو: اگر صبح صبح متعین وقت پر ہوائی جہاز پکڑنا ہو، یا کسی بہت بااثر آدمی سے ملاقات ہو جس سے اہم حاجت اٹکی ہوئی ہو یا نفع عظیم کی امید ہو، پھر بھی کیا آنکھ نہ کھلے گی، یا اس بات کا کامیاب اہتمام نہ کرو گے کہ آنکھ ضرور کھلے۔ یہ ایک کم درجے کے کام کی عام مثال ہے۔ اسی سے دین کے اور تربیت کے لیے دوسرے ضروری کاموں اور مجاہدوں کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

ارادے میں، مراد کی قدر و قیمت اور ضرورت کا یقین شامل ہوتا ہے، اسے کرنے کی یا حاصل کرنے کی چاہت اور محبت شامل ہوتی ہے، شعوری فیصلہ ہوتا ہے، اور ان سب سے مل کر عزم پیدا ہوتا ہے۔ جب قرآن یُرِیْدُوْنَ وَجْھَهٗ یا مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ (وہ اللہ کی خوشنودی کا ارادہ کرتے ہیں، چاہتے ہیں یا جو آخرت کی فصل کا ارادہ کرتے ہیں، چاہتے ہیں) کہتا ہے تو وہ ارادے کا لفظ انھی معنوں میں استعمال کرتا ہے۔

یہ ارادہ کمزور پڑ سکتا ہے، ٹوٹ سکتا ہے، اس کے خلاف آدمی کام کر سکتا ہے، وہ اسے بھول سکتا ہے، لیکن مجموعی طور پر، پہلے قدم پر اور ہمیشہ، رضائے الٰہی، آخرت، جنت اور اپنی تربیت کے لیے یہی ارادہ درکار ہے۔ اور ہر اس کام کے لیے بھی درکار ہے جو دین کی راہ پر چلنے اور اپنی تربیت کرنے کے لیے ضروری ہو۔ یہ ندامت اور شعوری انابت سے ایک لمحے میں دوبارہ استوار ہو سکتا ہے، ضعف کا شکار ہو، یا غفلت اور ٹوٹنے کا۔

یہ ارادہ موجود نہ ہو تو تعلیم و تربیت کی بڑی سے بڑی بارش بھی رائیگاں جائے گی۔ یہ موجود ہو، تو تعلیم و تربیت کی معمولی سی پھوار سے بھی لہلہاتی فصل کھڑی ہو جائے گی۔ بلکہ تعلیم و تربیت، وعظ و تلقین اور مطالعہ و درس نہ بھی میسر ہو تو یہ ارادہ خود ہی سب سے زیادہ موثر و کارگر معلم اور مربی ثابت ہو گا۔ یہ صحیح راہیں بھی دکھائے گا، ان راہوں پر قائم بھی رکھے گا، اور غلط راہوں پر جانے سے بھی روکے گا۔

یہ ارادہ یک سوئی بھی چاہتا ہے اور بالاتری بھی۔ بہ یک وقت اللہ اور غیر اللہ دونوں مقصود نہیں بن سکتے، آخرت اور دنیا دونوں ہدف نہیں بن سکتے۔ تم دو کشتیوں میں سوار ہونا چاہو گے تو کبھی ساحل مراد تک نہ پہنچو گے۔ ہمیشہ ضعف ارادہ اور عزم کی شکست و ریخت کا شکار رہو گے، ڈانواں ڈول رہو گے۔

ارادہ اسی طرح مضبوط اور یک سو ہو سکتا ہے کہ تم ان چیزوں کی انتہائی قدر و قیمت اور اپنے لیے شدید ضرورت پر یقین رکھو جو ارادہ کا مقصود ہیں۔ یعنی اللہ اور جنت اور ان کے حصول کے لیے اپنی تربیت۔ ارادہ اتنا ہی مضبوط اور یک سو ہو گا جتنا یہ یقین مضبوط اور یک سو ہو گا۔ یہ یقین اتنا ہی مضبوط ہو گا جتنا اللہ اور جنت کی محبت اور طلب کا جذبہ مضبوط ہو گا، اور پھر اتنا ہی عزم مضبوط ہو گا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اللہ سے، اس کے رسول سے اور اسؐ کی راہ میں جہاد سے ہر چیز سے بڑھ کر محبت کرو۔ اسی لیے قرآن میں جنت کا ذکر

تفصیل سے اور بار بار ہوا ہے۔ اور اس طرح ہوا ہے کہ وہ ایک زندہ متحرک حقیقت بن کر آنکھوں کے سامنے موجود رہتی ہو۔

ہم یہ پہلے بھی بتا چکے ہیں ---- اور پھر بتانا چاہتے ہیں ---- کہ عمل و کردار کی اصلاح و تعمیر ایک تدریجی اور وقت طلب کام ہے۔ ارادہ کا بننا پلک جھپکتے میں ہو سکتا ہے، اور ہوتا ہے۔ یہ پلک جھپکتے میں ٹوٹ بھی سکتا ہے، لیکن مایوسی کی کوئی بات نہیں: پلک جھپکتے میں واپس بھی آ جاتا ہے۔

سعی

ارادہ ہو تو ناگزیر ہے کہ اس کا ظہور عمل میں ہو۔ جس چیز کا ارادہ ہو اس کی طرف قدم اٹھنے کی صورت میں ہو، قدم نہ اٹھ سکیں تو پیش قدمی کے لیے آمادگی، آرزو اور جستجو کی صورت میں ہو، کم سے کم دل، نگاہوں، توجہ اور زندگی کا رخ مقصود ارادہ اور مرادِ دل کی طرف کر لینے کی صورت میں ہو، چل نہ سکو تو دل چلنے کے لیے بے تاب رہے، آنکھیں منزل پر جمی رہیں، دل منزل کی طرف لپکتا رہے، اور جب ممکن ہو قدم بھی لپک کے چلیں۔ قرآن مجید نے سعی کی ان ساری صورتوں کی تصویر کھینچی ہے: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا میں، "میں نے یک سو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین و آسمانوں کو پیدا کیا ہے" (الانعام ۶:۷۹) اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں، "کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے (الانعام ۶:۱۶۲)، اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں، "اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا: "مسلم ہو جا"، تو اس نے فوراً کہا: میں مالک کائنات کا "مسلم" ہو گیا۔ (البقرہ ۲:۱۳۱)، فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ میں، "اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ (سورة الجمعة ۶۲-۹)، اور بے شمار دیگر مقامات پر۔

یاد رکھو کہ سعی سے بڑی بڑی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ ایک شخص سے خواب میں ایک بزرگ نے کہا کہ صبح سب سے پہلے جس چیز پر نگاہ پڑے، اسے اٹھا کر منہ میں رکھ لینا۔ وہ صبح گھر سے باہر نکلا تو نگاہ ایک پہاڑی پر پڑی۔ اس نے ہمت ہار دی۔ پہاڑی کیسے منہ میں رکھی جا سکتی ہے! بزرگ پھر نمودار ہوئے: چلنا تو شروع کرو۔ اس نے چلنا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا، پہاڑی چھوٹی ہوتی گئی۔ جب پہاڑی تک پہنچ گیا تو دیکھا کہ وہاں گڑ کی ایک ڈلی تھی۔ اس نے اسے اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ دین کے، تربیت کے، جن کاموں کو تم مشکل، دشوار اور ناممکن سمجھتے ہو، ان سب کا معاملہ ایسی ہی پہاڑیوں کا ہے۔

یہی سبق اس شخص کے واقعہ سے ملتا ہے، جو رسول اللہؐ نے بیان فرمایا، جس نے ۹۹ قتل کیے تھے۔ وہ ایک عابد کے پاس گیا کہ کیا اب توبہ کی کوئی صورت ہے۔ عابد نے انکار کر دیا۔ اس شخص نے عابد کو بھی قتل

کر دیا۔ پھر ایک عالم کے پاس گیا۔ اس نے کہا' ہاں توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ توبہ کرو۔ لیکن یہ بستی چھوڑ دو' فلانی بستی میں چلے جاؤ جو نیک بستی ہے۔ اس شخص نے توبہ کر کے' نیک بستی کی طرف چلنا شروع کیا۔ راستے میں اسے موت آگئی۔ اس نے مرتے مرتے اپنا سینہ ہی مطلوب بستی کی طرف آگے بڑھا دیا۔ اب رحمت اور عذاب کے فرشتوں میں جھگڑا شروع ہو گیا کہ روح کون لے جائے۔ ایک فرشتے نے آکر فیصلہ دیا کہ فاصلہ ناپ لو' اگر لاش نیک بستی سے قریب ہو تو رحمت کے فرشتے لے جائیں' ورنہ عذاب کے فرشتے۔ اللہ تعالیٰ نے ادھر کی زمین کو حکم دیا کہ پھیل جائے' ادھر کی زمین کو حکم دیا کہ سکڑ جائے۔ اس کے بعد نیک بستی کا فاصلہ ایک بالشت کم نکلا۔ چنانچہ رحمت کے فرشتے اس کی روح لے گئے۔

اس کہانی کے اسباق و اسرار پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ لیکن مقصود واضح ہے: نیت صادق ہو' ارادہ مضبوط ہو' اور سعی ہو' تو دیکھو اللہ کی رحمت کس طرح دست گیری کرتی ہے اور منزل مراد تک پہنچا دیتی ہے۔

حرف آخر

تو بس یاد رکھو کہ تربیت تمھارے اپنے ارادے اور کوشش سے ہو گی۔ اپنا ارادہ اور کوشش ہو گی تو ہر تربیت مفید ہو گی' اللہ کی بے پایاں رحمت بھی شامل حال ہو گی۔ تم خود اپنی تربیت نہ کرو گے تو کوئی تمھاری مدد نہیں کر سکے گا۔ چلنے' اور چلتے رہنے کے لیے کمر باندھ لو۔ یہی پہلا قدم ہے' یہی آخری قدم ہے۔

کہتے ہیں: ووٹ دینے سے فیصلہ ہوتا ہے

لیکن کتنے ہی فیصلے ووٹ نہ دینے سے ہو جاتے ہیں۔

آپ اپنی مرضی لیے گھر بیٹھے رہ جاتے ہیں'

اور آپ کی مرضی کے خلاف فیصلہ ہو جاتا ہے۔

خاموش اکثریت پر اقلیت حکمراں ہو جاتی ہے!

اس دفعہ ایسا نہ ہونے دیجیے

دیانت دار' اللہ سے ڈرنے والی' کرپشن سے پاک حکومت

یقیناً اکثریت کے دل کی آواز ہے

یہ دل کی آواز' دل میں نہ رہ جائے۔

باہر نکلیے' ووٹ ڈالیے:

اپنے لیے' اپنی آیندہ نسلوں کے لیے'

ملک کی خوشحالی کے لیے' سکون و چین کے لیے'

امت مسلمہ کے مستقبل کے لیے'

آپ کا درست ووٹ باطل کے ایوانوں میں لرزہ طاری کرنے کی قوت رکھتا ہے۔

گھر بیٹھے رہے' تو اپنے اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے؟

(خیر خواہ)

اسلام کا بین الاقوامی قانون ' ایک تقابلی جائزہ - ۲

محمود احمد غازی

دنیا کے مختلف علاقوں میں بین الاقوامی قوانین کے آغاز و ارتقا کے تقابلی مطالعے سے چند باتیں بنیادی طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں: ایک یہ کہ کسی بھی قوم نے ماسوائے مسلمانوں کے بین الاقوامی انصاف کی بنیاد پر دنیا کو کوئی قابل عمل عالمی نظام نہیں دیا۔

دوسرے یہ کہ ان تمام نظاموں نے دنیا میں انسانوں کو طبقات میں تقسیم کیے رکھا۔ کہیں دو حصوں میں' کہیں تین حصوں میں' اور کہیں چار حصوں میں۔ اس تقسیم میں طاقتور گروہ کو بے تحاشا اختیارات حاصل تھے اور کمزور ہر قسم کے حقوق سے محروم تھا۔ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن پاک نے واضح طور پر غلط قرار دیا۔ فرعون کے بارے میں فرمایا' إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (القصص ۲۸:۴) واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا' اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ قرآن نے اس کردار کے شخص کے بارے میں اعلان کیا إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ کہ وہ فساد پھیلانے والوں میں سے تھا' چنانچہ قرآن کی نظر میں ہر وہ نظام خواہ داخلی ہو یا خارجی' جو انسانوں کے درمیان مساوات کی بجائے درجہ بندی پر ایمان رکھتا ہو' جہاں دولت مند اور بااثر لوگ ہی حقوق و مراعات سے متمتع ہوتے ہوں اور باقی لوگ ثانوی حیثیت رکھتے ہوں' فرعونی نظام ہے۔

تیسری چیز جو ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ ان تمام قوانین میں بین الاقوامی قانون کا دائرہ کار صرف اس حد تک محدود رہا کہ جنگ کی صورت میں مقتولین سے کیا معاملہ کیا جائے' مقتولین کی جائیداد کو کس طرح سے استعمال کیا جائے اور فاتحین ایک سے زاید ہوں تو مقتولین کی جایداد کو ان کے درمیان کس طرح تقسیم کیا جائے۔

یہ وہ بنیادی چیزیں تھیں جو تقریباً تمام بین الاقوامی قوانین کی اساس تھیں۔ مہابھارت اور رامائن سے

لے کر ارتھ شاستر اور منو سمرتی تک ہندوؤں کے ہاں تمام کتابیں جن کو آج کل کے ہندو مصنفین بین الاقوامی قانون کا قدیم ماخذ قرار دیتے ہیں' ان سب میں یہی ہے کہ اگر کوئی قوم مفتوح ہو جائے تو اگر فاتح کے مقابلے میں نسلی اعتبار سے برابر کی ہے تو اس سے اس طرح کا سلوک کیا جائے' اگر کم تر درجے کی ہے تو اس سے اس طرح کا سلوک کیا جائے۔ پورا نظام مساوات کی بجائے انسانوں کی تفریق و تقسیم پر مبنی ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے جو کچھ دیا' وہ فقہ و شریعت کے طلبہ سے مخفی نہیں ہے۔ میدان علم میں یورپ کے تمام تر ارتقا کے باوجود اسلام کا بین الاقوامی تعلقات کا قانون آج بھی اتنا متوازن' معتدل اور مبنی بر انسانیت ہے کہ ابھی مغرب کو وہاں تک پہنچنے میں نہ معلوم کتنی صدیاں درکار ہیں۔ یورپ نے میونسپل لا میں جو کچھ ابھی حاصل نہیں کیا' اسلام نے اس سے بھی آگے جا کر اسے اپنے انٹرنیشنل لا میں سمو دیا ہے۔ ملک کے اندر بغاوت سے نمٹنا اور اس سے عہدہ برآ ہونا دنیا کے تمام قوانین میں موجود ہے اور کریمنل لا کا موضوع ہے۔ لیکن شریعت اسلامی کی رو سے یہ خالصتاً بین الاقوامی قانون (علم سیر) کا موضوع ہے۔ اسی طرح سے محاربین اور قزاقوں سے نمٹنا دنیا کی نظر میں داخلی فوجداری قانون کا موضوع ہے لیکن اسلام کے ہاں قزاقوں اور محاربین کا مسئلہ (فقہ سیر) انٹرنیشنل لا کا موضوع ہے۔ داخلی طور پر بغاوتوں سے نمٹنا دنیا میں فوجداری قانون کا موضوع ہے' لیکن اسلامی قانون کے مطابق یہ بین الاقوامی قانون کا موضوع ہے۔

اس سلسلے میں اسلام نے منعہ کا اصول دیا ہے' یعنی ہر وہ گروہ جو کسی ایسے نظریے یا اصول سے وابستگی کی بنیاد پر قوت حاصل کرتا ہے جو قرآن مجید یا سنت کے کسی اصول کی تاویل پر مبنی ہو' اس کے لیے الگ قوانین ہیں۔ ایک فرد اگر ریاست اور معاشرے کے خلاف تلوار اٹھاتا ہے تو اس کے لیے الگ قانون ہے۔ اسی طرح جو گروہ کسی نظریے یا عقیدے کے اختلاف کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے' اس پر بغاوت کے عام احکام نافذ نہیں ہوتے' بلکہ اس کے لیے فقہا نے تاویل کے احکام بیان کیے ہیں۔ ان کے ساتھ معاملہ نمٹانے کے الگ قوانین ہیں' جس میں ان کے اصول و نظریات کا احترام بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ نے خوارج کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ رکھا حالانکہ خوارج کے نظریات قرآن سے متصادم تھے۔ خوارج کے نظریات سے صحابہ نے کبھی اتفاق نہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود ان کے نظریات کا احترام کیا گیا۔ حضرت علیؓ نے ان کو واضح طور پر لکھا کہ جب تک تم بدامنی پیدا نہیں کرتے اور جب تک تم لوگوں کے جان و مال کے لیے خطرہ نہیں بنتے' تمھارے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا جائے گا۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اہل علم صحابہؓ کو ان کے نظریے کی اصلاح کے لیے بھیجا' اور طویل عرصے تک گفت و شنید اور اصلاح کی کوششوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ مشہور ادیب اور مورخ ابو العباس المبرد نے اپنی تالیف "الکامل فی اللغۃ والادب" میں خوارج اور عبداللہ بن عباسؓ کے درمیان ہونے والی اس طویل گفتگو کو جو مختلف ادوار پر مشتمل ہے' مکمل طور پر نقل

کیا ہے۔ اس گفتگو کی تفصیلات سے پتا چلتا ہے کہ داخلی جھگڑے اور سیاسی اختلاف کو حل کرنے کا اسلامی ڈھنگ کیا ہے اور یہ کہ صحابہ کرام نے خوارج کے ساتھ اپنے مذہبی اور سیاسی اختلافات کو پرامن طریقے سے طے کرنے کے لیے کیسی کیسی کوششیں کیں۔ بہرحال باغیوں اور محاربوں سے نبٹنا اسلامی نظام قانون کی رو سے قانون بین الاقوام ہی کا حصہ ہے۔

جب ہم بین الاقوامی قانون کے مصادر و مراجع کی طرف آتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بھی قوانین مرتب ہوئے، وہ سب کے سب بالعموم اور بین الاقوامی قوانین بالخصوص، ان سب کی ابتدا رسوم و رواج سے ہی ہوتی ہے۔ یہ رسوم و رواج طویل عرصہ جاری رہتے ہیں، جن کا آغاز کسی نہ کسی وقت کسی بااثر فرد یا بااختیار حاکم کے کسی نہ کسی من مانے فیصلے سے ہوتا ہے۔ عموماً یہ ایک صوابدیدی فیصلہ ہوتا ہے جس میں انصاف کم اور حاکم کی قوت و حشمت کو دخل زیادہ ہوتا ہے، اور یہ فیصلہ کمزور کو اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ وہ کمزور ہے۔ لیکن آگے چل کر یہی فیصلہ آنے والوں کے لیے ایک دلیل اور نظیر بن جاتا ہے اور یوں وہ قانون کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہی رسم و رواج اور ان کا یہی ارتقا بین الاقوامی قانون میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کے قانون بین الاقوام کی بنیادوں اور اساسی تصورات اور تعلیمات کی تشکیل میں کسی رسم و رواج کو دخل نہیں ہے۔ وہ کسی علاقے کا طور طریقہ یا کسی حاکم کا صوابدیدی یا من مانا فیصلہ نہیں۔ اسلام کے قانون بین الاقوام کی بنیاد تو ایک متعین اور ایک منضبط کتاب ہے جو قرآن پاک ہے، ایک منضبط عدالت کا فیصلہ ہے جو عدالت محمدیہؐ کہلاتی ہے۔

اسلام کا بڑے سے بڑا مخالف شاید یہ تو کہہ سکتا ہے کہ قرآن الہامی کتاب نہیں ہے، کوئی یہودی اور عیسائی اس کے منہجِ منزّلہ ہونے سے تو شاید انکار کر سکتا ہے، لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کتاب ایک مدون اور طے شدہ قانون کی شکل میں ابتدا میں موجود نہ تھی۔ یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں بیان کردہ قوانین کی ابتدا رسوم و رواج سے ہوئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب میں بیان کردہ بیشتر اصول پہلی بار اسی کتاب کی شکل میں سامنے آئے اور اسی کتاب نے پہلی بار دنیا میں انھیں متعارف کرایا۔ اس لیے جیسا کہ آج قانون دان کہتے ہیں کہ غیر متعین (undefined) قانون کے مقابلے میں متعین (defined) قانون زیادہ بہتر ہے اور پایدار ہے، یہ (قرآن) تو آغاز ہی سے ایک defined اور مہذب قانون تھا، اور ایک مہذب قانون کی تمام شرائط کو پورا کرتا تھا۔ اس کے بالمقابل دیگر قوانین غیر مہذب، غیر متعین اور undefined تھے۔

ان تمام قوانین و اقوام میں عوام کے لیے الگ قانون تھا اور خواص کے لیے الگ قانون تھا۔ اپنوں کے لیے الگ قانون ہوتا تھا اور غیروں کے لیے الگ۔ یونانیوں کے ہاں تصور یہ تھا کہ ہم وطنوں کے لیے تو طے شدہ قوانین موجود ہیں، لیکن بقیہ تمام انسانوں کے لیے ہم اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ رومیوں

نے بھی یہی طے کیا تھا کہ رومیوں کے حلیف فرمانرواؤں یعنی یورپ کے حکمرانوں کے لیے ایک طے شدہ قانون ہو گا اور بقیہ تمام انسانوں کے لیے فاتحین اور زور آوروں کی صوابدید پر فیصلہ کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں مغربی دنیا میں جو قانون مرتب کیے گئے وہ صرف عیسائیوں کے لیے تھے۔ غیر عیسائیوں کے لیے صوابدیدی فیصلے ہوتے تھے۔ حکمران اپنی فوجی قوت اور ذہنی استعداد کے مطابق ان (غیر عیسائیوں) کے بارے میں فیصلہ کر سکتا تھا۔ آج بھی یورپ کے بین الاقوامی قوانین میں مہذب دنیا (civilized World) اور غیر مہذب دنیا (uncivilized World) کی تقسیم موجود ہے، جس کو وہاں بین الاقوامی قانون کے جد امجد نے بھی قانون کی کامیابی کی ایک شرط قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ فیصلہ کہ مہذب کون ہے، اور غیر مہذب کون، وہاں کے حکمران کرتے ہیں۔ وہ جس کو چاہیں مہذب قرار دے دیں اور جس کو چاہیں غیر مہذب قرار دے دیں۔ اس کا مشاہدہ آج کے بین الاقوامی معاملات میں کسی بھی اخبار کے بین الاقوامی خبروں کے صفحات پر کیا جا سکتا ہے۔ یورپ میں یہ چیز نئی نہیں ہے بلکہ یہ ان کے ماضی کا تسلسل اور اصول قانون کی بنیاد ہے۔

اس کے برعکس آپ اسلام کے قانون کی طرف آیئے تو آپ دیکھیں گے کہ اسلام نے بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل، مہذب و غیر مہذب سب کو ایک یکساں اور مکمل قانون، قرآن کی صورت میں دے دیا۔ اور صوابدیدی اختیارات کو قطعاً روا نہیں رکھا۔ پھر اس قانون میں اس نے ترمیم و تنسیخ کا اختیار کسی بڑے سے بڑے فرد حتیٰ کہ پیغمبر اسلام کو بھی نہیں دیا۔ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس کے کسی حکم میں کمی بیشی کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ صوابدیدی اختیارات کے خاتمے کی ایسی اعلیٰ مثال دنیا کے کسی قانون یا قوم میں ہمیں نہیں ملتی ہے۔

ایک اور اہم اور قابل ذکر چیز جو مغرب کے قانون بین الاقوام کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہاں قانون کے بنیادی اصول و تصورات بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہے، قانون کی کتابیں کچھ عرصے کے بعد قابل اصلاح و ترمیم ہو جاتی ہیں اور دو ایک عشرے گزرنے کے بعد یہ کتابیں دفتر بے معنی قرار دے کر داخل دفتر کر دی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس فقہ کے احکام کا وہ حصہ جو اسلامی قانون کے بنیادی ڈھانچے کی تشکیل کرتا ہے، وہ ایسا عالمگیر ہے کہ اس میں کسی تبدیلی و تنسیخ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تفصیلات ہمارے ہاں بھی بدل سکتی ہیں۔ رسوم و رواج کے بدلنے سے جزئیات میں تبدیلی ممکن ہے۔ احکام میں ارتقا و پیش رفت جاری رہتی ہے۔ لیکن قانون کا جو بنیادی ڈھانچہ ہے اور جو بنیادی تصورات ہیں وہ قرآن و سنت میں محفوظ ہیں جو ہر قسم کے تغیر و تبدل سے ماورا ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی تصنیف "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں تغیر و ثبات کے درمیان جو ہم آہنگی اسلام نے قائم رکھی ہے اس کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا کے بعض قوانین وہ ہیں اور بعض نظام و تصورات

ایسے ہیں جو صرف تغیر پر مبنی ہیں۔ جیسا کہ آج کے دور میں وضع قانون کے سلسلے میں آپ دیکھتے ہیں کہ روز قوانین اور تصورات میں تبدیلیاں لائی جاتی ہیں اور کچھ قوانین وہ ہیں جو صرف ثبات پر مبنی ہیں۔ جو لوگ یا قوم صرف ثبات پر زور دیتی ہے اس کے لیے حالات کا ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے اور جو قومیں اپنے نظام اور قانون کے بنیادی تصورات کو بدلتی رہیں ان کے ہاں قانون میں کوئی ثبات اور دوام نہیں رہتا۔ اور یہ چیز قانون کے تشخص کو ختم کر دیتی ہے۔ اسلام نے دونوں کا خیال رکھا ہے۔ اس میں تشخص کا تحفظ بھی ہے، ثبات و دوام کی ضمانت بھی، اور بدلتے ہوئے حالات کی رعایت بھی۔ قرآن و سنت کے نصوص تسلسل اور تشخص کی ضمانت فراہم کرتے ہیں اور اجماع و اجتہاد کے ذریعے تغیر کے تقاضوں کو سمویا گیا ہے۔ قرآن پاک کا یہ اصولی توازن اور نظری اعتدال جہاں داخلی قوانین میں دکھائی دیتا ہے وہاں وہ بین الاقوامی قوانین میں بھی نظر آتا ہے۔

اسلامی بین الاقوامی قانون کا ایک اہم اصول اور اساسی تصور "مجازات" ہے۔ بین الاقوامی لین دین میں یہ سوال بڑا اہم ہے کہ برابری اور مساوات کیا ہے اور برابری کی سطح پر لین دین کیسے ہوتا ہے۔ جو سلوک آپ اپنے ساتھ کرتے ہیں وہی سلوک دوسروں کے لیے بھی ہے۔ بشرطیکہ وہ سلوک شریعت کے احکام کی رو سے جائز اور انسانی احترام سے ہم آہنگ ہو، اور اخلاق و کردار کے اسلامی تصورات پر پورا اترتا ہو۔ اس حد تک معاملہ برابری کی سطح پر رکھا جائے گا۔ اس اصول کی بنیاد پر فقہائے کرام نے بہت سے قوانین مرتب کیے ہیں۔ لیکن "مجازات" کے اصول کو ایک طویل عرصے تک مغربی مفکرین نے تسلیم نہیں کیا۔ آج بھی مغربی دنیا کے بیشتر ممالک برابری کے اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ آج بھی وہ اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں کہ مشرق و مغرب کے درمیان "مجازات" کا اصول کارفرما ہو۔ دنیائے اسلام اور دنیائے مسیحیت کے درمیان "مجازات" انھیں آج بھی قبول نہیں۔ آج بھی ان کا نظام جیسا کہ ادارہ اقوام متحدہ کی شکل میں ہمارے سامنے ہے، کچھ خاص اقوام اور نسلوں کی برتری پر قائم ہے، جس میں ایک نسل کا نمایندہ پوری نسل انسانیت کے فیصلے کو ویٹو کر سکتا ہے۔ ویٹو کا یہ تصور صاف صاف بتاتا ہے کہ نسل انسانی کے درمیان مساوات انھیں آج بھی قبول نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ عدم مساوات کا یہ تصور محض ایک اتفاق ہے یا محض وقتی سیاسی حقائق کا ایک مظہر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی ان اقوام نے اسے ایک قانون بلکہ مذہبی فتوے کی شکل دے دی ہے، ایسا فتویٰ جسے انھوں نے اپنے قانون میں باقاعدہ ایک ضابطے کی شکل دے دی ہے۔ یہودیوں کے ہاں گوئیم کا فلسفہ ہے، ہندوؤں کے ہاں ملیچھ کا تصور ہے، ہندوؤں میں چار ذاتوں کا تصور ہے، اسی طرح ارسطو کے ہاں جو نسلی تفریق اور امتیاز ہے اس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔

اس کے ساتھ ایک اور بڑا نمایاں فرق جو مغرب کے بین الاقوامی قانون میں اور اسلام کے قانون بین

الاقوام میں پایا جاتا ہے، وہ قانون کی قوت نافذہ کا معاملہ ہے، وہ قوت نافذہ جس کے بل بوتے پر کسی قانون کو نافذ کیا جاتا ہے اور جس کے بھروسے پر قانون کی حاکمیت پر لوگوں کا اعتماد قائم ہوتا ہے۔ اس امر کے باوجود کہ دنیا میں ایک ہزار سال سے مغرب کا یہ بین الاقوامی قانون رائج رہا ہے، اس حقیقت کے باوجود کہ Law of Nations کو انھوں نے خود ہی مرتب کیا، اس امر کے بلوصف کہ مغربی زبانوں میں بین الاقوامی قانون پر ہزارہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس حقیقت کے باوجود کہ آج کہنے کو وہاں ایک بین الاقوامی عدالت انصاف بھی موجود ہے، اس امر کے باوجود کہ وہاں سلامتی کونسل جیسا بااثر ادارہ بھی موجود ہے، جس کے بارے میں دعویٰ یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی قانون کے احکام پر عمل در آمد کراتا ہے، لیکن اس تمام تر مساعی کے باوجود اہل مغرب کو خود اپنے قانون بین الاقوام پر ابھی تک اطمینان کلی حاصل نہیں ہوا۔ وہ ابھی تک حتمی طور پر یہ طے نہیں کر سکے کہ یہ قانون ہے بھی یا نہیں۔

بات یہ ہے کہ قانون کا ان کے ہاں اپنا ایک تصور ہے۔ قانون کے بارے میں مغربی مفکرین نے جو کچھ لکھا ہے، وہ قانون کا طالب علم جانتا ہے۔ ان کے ہاں کچھ لوگوں کے نزدیک قانون سے مراد اصول و ضوابط کا وہ مجموعہ ہے جس کو کوئی بالاتر قوت دوسروں پر نافذ کرے۔ مشہور انگریز قانون دان، جان آسٹن نے لکھا ہے کہ قانون حاکم اعلیٰ کے حکم کا نام ہے۔ بعض نے کہا کہ قانون وہ ہے جسے کوئی عدالت نافذ کرے۔ اس کے بعد ماضی قریب میں ایک قانون دان، کیلسن نے بیان کیا کہ کسی بالادست اور طاقتور حکمران کا حکم قانون ہے۔

اگر قانون کی ان تعریفات کو مد نظر رکھا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بین الاقوامی معاملات اور بین الممالک لین دین میں ان بنیادوں پر کوئی قابل عمل ضابطہ تشکیل دیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہ بین الاقوامی قوانین کے احکام کسی دنیاوی بالادست حاکم کے دیے ہوئے ہیں اور نہ ان کے نفاذ کا کوئی موثر بندوبست موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مفکرین اور قانونی ماہرین کی ایک خاصی تعداد ایسی ہے جس نے بین الاقوامی قانون کو سرے سے قانون ہی تسلیم نہیں کیا۔ کسی نے کہا بین الاقوامی قانون، قانون کا نقطہ زوال ہے۔ کسی نے کہا کہ قانون بین الاقوام کو قانون کہنا تکلف ہے۔ کسی نے کہا:

International law is merely an international morality.

کہ بین الاقوامی قانون محض بین الاقوامی اخلاق ہے۔ ان نظریات کی پشت پر جو اصل وجہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون خود ان کے اپنے تصور قانون کی رو سے قانون کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ نہ اس کو کسی بالاتر قوت نے نافذ کیا، نہ اس کی پشت پر کوئی عدالتی نظام ہے کہ خلاف ورزی کرنے والے کو سزا دے سکے، نہ اس کے نفاذ کے لیے کوئی قوت حاکمہ موجود ہے۔ اس لیے اس کو قانون تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ اگرچہ وہاں بعض قانون دان اسے قانون مانتے اور کہتے ہیں۔ یہ بحث وہاں رہی ہے اور اب بھی جاری ہے۔

اسلام کے قانون بین الممالک کی طرف آیئے تو یہاں فقہا کے ہاں کبھی یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوا کہ اسلام کا قانون بین الاقوام یعنی "سیر قانون" ' قانون ہے یا نہیں۔ اسلام میں جس طرح مسلمان اللہ پر ایمان رکھنے کا پابند ہے، اسی طرح وہ قانون بین الاقوام کے احکام پر عمل کرنے کا بھی پابند ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جس طرح ایک مسلمان زکوٰۃ اور حج ادا کرنے کا پابند ہے، اسی طرح سے مسلمان "سیر کے احکام" کی پابندی کرنے کا بھی پابند ہے۔ جس طرح ایک مسلمان شراب نوشی کو حرام سمجھتا ہے، اسی طرح سے ایک مسلمان معاہدے کی خلاف ورزی کو بھی حرام سمجھتا ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کے ہاں جہاں تک "احکام سیر" کی پابندی اور ان کے واجب التعمیل ہونے کا تعلق ہے۔ بالفاظ دیگر جہاں تک اس کی اندرونی قوت نافذہ (inner sanction) کا تعلق ہے، وہ دونوں قسم کے احکام پر یکساں محیط ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے ہاں یہ اختلاف کبھی پیدا نہیں ہوا جو یورپ میں پیدا ہوا ہے۔ فتح سمرقند کی مثال ہمارے سامنے ہے، جہاں اسلام کے بین الاقوامی قانون کو میونسپل لا کی طرح ایک مسلمان عدالت نے باقاعدہ نافذ کیا، اور اس کی پابندی کروائی گئی۔ یہاں ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی کہ ایک حاکم مطلق فرماں روا جو بہت بڑی سلطنت کا مالک ہے اور جس کی طاقت اور رعب سے ایک دنیا خائف رہتی ہے، اس کی فاتح اور جہاں گیر فوجوں کو ایک عالم کا فتویٰ روک دیتا ہے۔ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں ایک صحابی حضرت عمروؓ بن عنبسہ نے ایک واقعہ وقوع پذیر ہوتے دیکھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس واقعہ میں اسلام کے قانون بین الاقوام کی خلاف ورزی کا امکان ہے۔ انھوں نے ایک حدیث نبویؐ بیان کی اور بڑھتی ہوئی فوجیں واپس چلی گئیں۔ یہ ہے اسلام کے قانون اور شریعت کی رو سے قانون بین الممالک کا اسلامی تصور۔ اس لیے مسلمانوں کے ہاں قانون بین الممالک کی تشریح و تعیین میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ یہ ہمیشہ سے ایک باقاعدہ اور مکمل قانون تھا اور اب تک ایک باقاعدہ اور مکمل قانون چلا آتا ہے۔

اس تقابلی جائزے سے واضح ہوا ہے کہ قانون سے متمتع ہونا اور اس کے فوائد حاصل کرنا دنیا میں صرف اور صرف طاقتور کے لیے ممکن تھا۔ کمزور کے لیے کوئی قانون نہ تھا۔ صرف حاکم کے صوابدیدی اختیارات ہوتے تھے، جو حاکم کے ذاتی طور پر مہربان ہونے کی صورت میں کمزور کا مداوا کرتے تھے، ورنہ نہیں۔ طاقتور کے لیے سارے قانون اور مراعات تھیں اور آج بھی ہیں۔ might is right کا قانون پہلے بھی چلتا تھا، اور آج بھی چلتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام کے قانون بین الممالک کی بات ہو یا میونسپل لا کی، یہ صرف کمزور کے حقوق کے تحفظ کے لیے ہے۔ اسلامی قانون کے ایک مجتہد اعظم، اسلامی شریعت کے سب سے بڑے مزاج شناس اور اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے حاکم نے اسلامی قانون کی اس خصوصیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا: "تم میں جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک اس وقت تک طاقتور ہے جب تک میں اس

کا حق اس کو نہ دلوا دوں، اور تم میں سے جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک اس وقت تک کمزور ہے جب تک وہ حق ادا نہ کرے"۔ اسی لیے قانون کی روح یہ ہونی چاہیے کہ وہ کمزور کا محافظ ہو، نہ کہ طاقتور کا۔ اسلام کے قانون بین الاقوام نے ہمیشہ کمزوروں کو قوت فراہم کی، اس نے ہمیشہ مظلوموں کو انصاف دیا۔ اگر قانون کی طاقت بھی طاقتور کی تائید کرنے لگے تو کمزوروں اور مظلوموں کے سارے سہارے ختم ہو جائیں۔ قانون کی حقانیت اور عدل گستری کی یہ سب سے بڑی ترازو ہے جو صدیق اکبرؓ نے آج سے چودہ سو سے زائد سال قبل ہمیں دی تھی۔ اس ترازو پر اسلام کا قانون ہی پورا اترتا ہے۔

یہ وہ چند بنیادی مسائل ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کا قانون بین المالک اور دیگر اقوام کے قانون بین المالک میں کیا بنیادی فرق ہے؟ وہ کون سے امتیازی اوصاف ہیں جو اسلام کے قانون کو دیگر اقوام کے قانون سے ممیز کرتے ہیں؟ انسانیت کے لیے فلاح و بہبود دنیا کے دیگر قوانین میں کتنی ہے، اور اسلام کے قانون میں کتنی ہے؟ اسلام کے قانون بین الاقوام یا میونسپل لا دونوں کے سلسلے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان اگر اللہ کے ہاں حضوری اور جواب دہی کا احساس رکھتا ہو، اور اسوہ رسولؐ کے زیر سایہ اس کی تربیت ہوئی ہو تو اس کے اندر تعمیل قانون کے لیے ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جس کی موجودگی میں کسی اور قوت قاہرہ کی ضرورت نہیں رہتی جو انسان سے قانون کی تعمیل کرائے۔ یہی اسلام کے قانون کا وہ طرۂ امتیاز ہے جو اسلام کے قانون کو دیگر بین الاقوامی قوانین سے ممتاز کرتا ہے۔

فرانس کے مسلمان

مسلم سجاد

اسکولوں میں اسکارف پہن کر آنے کی ممانعت اور اس پر مقدموں نے فرانس کے مسلمانوں کے مسائل کو خبروں کا موضوع بنا دیا۔ برطانیہ اور امریکہ میں تو کثیر ثقافتی (multicultural) نقطہ نظر اختیار کیا جاتا ہے لیکن فرانس میں تارکان وطن سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مخصوص مذہبی اور تہذیبی امتیازات کو اتنا غیر واضح کر لیں کہ وہ مقامی افراد میں اجنبی کی طرح نہ رہیں۔ ان کے رنگ اور بال کیسے ہی ہوں' لیکن وہ فرانسیسی زبان بولیں' فرانسیسی کھانے کھائیں' فرانسیسی لباس پہنیں' فرانسیسی رسوم و رواج اختیار کر لیں۔ بس یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اکثریت کا مذہب' اختیار کر کے رومن کیتھولک ہو جائیں۔ سیکولر فرانس میں مختلف مذاہب ہیں لیکن مذہبی امور کو نجی دائرہ تک محدود رکھا جاتا ہے۔ وزیر داخلہ کے تارکان وطن کے لیے مشیر جین کلاڈے نے مسلمانوں کو صاف صاف بتا دیا ہے: "جب کوئی وطن ترک کر کے آتا ہے تو وہ اپنا ملک ہی نہیں' اپنی تاریخ بھی تبدیل کر لیتا ہے۔ آنے والوں کو سمجھنا چاہیے کہ اب ان کے آبا و اجداد تبدیل ہو گئے ہیں اور ان کا نیا وطن ہے--- لیکن مسلمان تارکان وطن فرانس میں تو آباد کاروں کی طرح آ رہے ہیں' ان کے سامان میں خدا اور اسلحہ ہے۔ آج فرانس کو حقیقی اسلامی خطرہ درپیش ہے جو مسلم بنیاد پرستی کی عالمی لہر کا حصہ ہے"۔

یہ دو سال قبل کی بات ہے جب طالبات کو اسکارف پہننے پر اسکولوں سے نکالا جا رہا تھا اور الجیریا کے "انتہا پسندوں" کے حامیوں کو بڑی تعداد میں گرفتار کیا جا رہا تھا۔ آج بھی وہی صورت حال ہے۔ اسکارف کا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا ہے۔ الجیریا میں مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کے جرم میں ۲۰۰ افراد فرانس کی جیلوں میں پڑے ہیں۔

مردم شماری میں مذہب کے بارے میں سوال منع ہے' اس لیے صرف اندازہ ہی ہے کہ یہاں ۴۰ سے ۵۰ لاکھ مسلمان ہیں۔ یہ مغربی یورپ کی سب سے بڑی مسلم آبادی ہے۔ اسلام' فرانس کا دوسرا سب سے بڑا مذہب ہے۔

فرانس کے مسلمان شمالی افریقہ خصوصاً الجیریا یا ترکی سے آئے ہیں۔ نصف فرانسیسی شہری ہیں' فرانس

فرانس کے سماجیات کے ماہرین بھی اب یہ کہہ رہے ہیں کہ جذب کرنے کا ماضی کا ماڈل اب قابل عمل نہیں۔ نئے ماڈل میں اہم فرانسیسی اقدار، آزادی، مساوات مرد و زن اور سیکولر نقطہ نظر کو محفوظ رکھ کر مسلمانان فرانس کو برطانیہ و امریکہ کی طرح آزادانہ تشخص کی ضمانت دی جانا چاہیے۔ لیکن نیشنل فرنٹ کے خیالات رکھنے والے اسے تسلیم نہیں کرتے۔ فرانسیسی اپنی تہذیب کو برتر مانتے آئے ہیں۔ ان کا، دنیا کو تہذیب کا درس دینے کا مشن ترک کرنے پر آمادہ ہونا، آسان نہیں ہے۔

(ماخوذ از ہفت روزہ اکنامسٹ لندن، ۱۶ نومبر ۹۶)

تیار جوشاندہ

ہمدرد کی جوشینا

نئے میٹلائزڈ ساشے میں نباتاتی اجزاء اور روغنیات کے شفابخش قدرتی خواص مکمل طور پر محفوظ

زیادہ پُرتاثیر، زیادہ پُرافادیت



نزلہ، زکام، کھانسی اور گلے کی خراش کے علاج کے لیے قدرت کے شفاخانے میں جوشاندے کے نباتاتی اجزاء کی افادیت صدیوں سے مسلّمہ ہے۔ تحقیق و تجربات کی روشنی میں جدید طریقے سے حاصل کردہ جوشاندے کا خلاصہ "جوشینا" نہ صرف نزلہ، زکام، کھانسی، گلے کی خراش اور ان کے باعث ہونے والے بخار کا تدارک کرتی ہے بلکہ ان تکالیف کے خلاف قوتِ مدافعت میں بھی اضافہ کرتی ہے۔

گھر ہو یا دفتر نزلہ، زکام، کھانسی اور گلے کی خراش سے نجات کے لیے ہمدرد کی جوشینا کا ایک ساشے گرم پانی کے ایک کپ میں حل کیجیے: جوشاندے کی ایک مؤثر خوراک تیار ہے۔ نہ جوشاندہ اُبالنے کی زحمت، نہ چھاننے کا تردد۔

نزلہ زکام — جوشینا سے آرام

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔
آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ ہمدرد خریدتے ہیں۔ جائز منافع بین الاقوامی شہرِ علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

Adarts-HMD/J-1/95

مولانا عبدالرحیم چترالی (مرحوم)

عنایت اللہ فیضی

تحریک اسلامی کے دیرینہ رفیق جماعت اسلامی پاکستان کے مرکزی رہنما' جید عالم دین' شعلہ بیاں خطیب' جامعہ حدیقۃ العلوم المرکز الاسلامی پشاور کے مہتمم اور سابق ایم۔این۔اے مولانا عبدالرحیم چترالی ۱۷ نومبر ۱۹۹۶ کو لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں وفات پاگئے۔ آپ اکتوبر ۱۹۹۳ میں پاکستان اسلامی فرنٹ کے ٹکٹ پر چترال سے رکن اسمبلی منتخب ہوئے تھے۔ اپنی تین سالہ پارلیمانی زندگی میں جماعت اسلامی پاکستان کی پارلیمانی پارٹی میں انھوں نے اسلام کی سربلندی اور باطل قوتوں کی سرکوبی کے لیے ایوان کے اندر اور باہر نمایاں جدوجہد کی۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۶ کو اپنی وفات سے اکیس دن اور قومی اسمبلی کی تحلیل سے نو دن پہلے جماعت کی پارلیمانی پارٹی کے ہمراہ اپنی نشست سے مستعفی ہو گئے تھے۔

مولانا عبدالرحیم چترالی کا شمار جماعت اسلامی پاکستان کے نامور مرکزی رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ وہ مولانا گلزار احمد مظاہری کی قیادت میں بننے والے اتحاد العلما پاکستان کے بانی اراکین میں سے تھے۔ اپنی سحر انگیز خطابت کی وجہ سے آپ کو عوام و خواص میں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔ مجاہدین کی صفوں میں آپ کی بڑی عزت و تکریم تھی اور نجد و حجاز کے علما بھی آپ کی بے پناہ قدر کرتے تھے۔ آپ کی جدائی جماعت اسلامی پاکستان کے لیے بڑا صدمہ ہے۔ ملک کی سیاسی زندگی میں آپ کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا' وہ ایک عرصے تک پر نہیں ہو سکے گا۔ علمی اور دینی حلقوں میں آپ کی کمی کو تادیر محسوس کیا جاتا رہے گا۔ مگر سب سے بڑا نقصان چترال کا ہے' جو اپنے سرپرست اور اپنی شناخت سے محروم ہو گیا ہے۔

مولانا عبدالرحیم چترالی ۱۹۴۲ میں چترال کے ایک خوب صورت گاؤں بروز میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان میر رئیسہ قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے جن کا پیشہ آبا سو پشت سے سپہ گری رہا ہے۔ ان کے اجداد حکومت' سفارت اور وزارت کے مناصب پر فائز رہے۔ مرحوم کو بچپن سے تحصیل علم کا شوق ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ چترال کے ممتاز عالم دین مولانا عین القضاۃ بروز میں ان کے محلے گولرہ میں رہتے تھے اور شاہی مسجد سے ملحق دارالعلوم اسلامیہ میں پڑھاتے تھے۔ مگر اس بچے کے دل میں علم کی جو تڑپ تھی وہ اسے گھر بیٹھ کر پڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس لیے گھر سے نکلے اور صوبہ سرحد کے مختلف چھوٹے بڑے مدارس سے

ہوتے ہوئے پنج پیر صوابی میں شیخ القرآن مولانا محمد طاہرؒ کے مدرسے میں پہنچ گئے۔ یوں وقت کے بہت بڑے عالم، مجاہد، مجدد اور فقیہ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا لیکن بقول علامہ اقبال ۔ "تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں"۔ آپ کی سیماب صفت طبیعت نے پنج میں رہتے ہوئے ۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور کا رخ کیا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتب و رسائل سے استفادہ شروع کیا۔ آپ کے ہم جماعت پروفیسر سید عبدالجلال (گلگت) کا کہنا ہے کہ ہم لوگ مولانا مودودیؒ کا لٹریچر حضرت شیخ القرآن سے چھپاتے تھے لیکن مولانا عبدالرحیم نے اسے راز نہیں رہنے دیا۔ سرزنش ہوئی مگر تریاق نے اپنا اثر دکھایا۔ حضرت شیخ القرآن زیادہ دیر تک اپنے شاگرد اور مولانا مودودیؒ کے درمیان حائل نہ رہ سکے۔ ۱۹۴۹ کی سیاسی تحریک میں مولانا عبدالرحیم چترالی جماعت اسلامی کے ہراول دستے میں شامل ہو چکے تھے۔ ان دنوں جماعت کے تربیتی اجتماعات میں سرحد کے اکابر علما میں سے مولانا معین الدینؒ اپنے بے مثل حافظے کے ساتھ نرم اور دھیمے لہجے میں درس قرآن اور درس حدیث دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھار مفتی سیاح الدینؒ کاکاخیل بھی یہ فریضہ انجام دیتے۔ مولانا عنایت الرحمٰن کا شمار متاخرین میں ہوتا تھا۔ مولانا گوہر رحمٰن کی خطابت کا ابھی نیا شہرہ تھا جب کہ مولانا عبدالرحیم اور مولانا محمد منیر "عشق بلاخیز" کے "قافلہ سخت جان" میں نئے نئے شامل ہوئے تھے۔

حصول تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا عبدالرحیم چترالی نے کریم پورہ پشاور کی ایک پرانی مسجد میں حدیقۃ العلوم کے نام سے اپنا مدرسہ قائم کیا۔ اور ڈبگری کی ایک مسجد میں خطابت کا فریضہ انجام دینے لگے۔ شہر میں مستقل قیام کے بعد جماعت کے شہری نظم سے وابستہ ہوئے اور انہماک کے ساتھ فریضہ اقامت دین کے لیے کام کرنے لگے۔ سردار گڑھی میں المرکز الاسلامی کی تعمیر کے بعد مدرسے کو شہر سے باہر منتقل کیا۔ دو بار پشاور کے امیر منتخب ہوئے، صوبائی اور مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ مارچ ۱۹۷۷ کے عام انتخابات کے لیے انھیں چترال سے قومی اسمبلی کا ٹکٹ دیا گیا۔ اس الیکشن میں آپ پاکستان پیپلز پارٹی کی دھاندلی کا شکار ہوئے۔ ۱۹۸۵ کے غیر جماعتی انتخابات میں پھر چترال سے قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا۔ اکتوبر ۱۹۹۳ کے عام انتخابات میں آپ نے قومی اسمبلی کی نشست جیت لی۔ ۵ نومبر ۹۶ کو بستر علالت پر آپ نے بے نظیر حکومت کے خاتمے کی خبر سنی۔ باطل کی اس قوت کو گرانے کی حکمت عملی میں وہ خود شریک رہے تھے اور جماعت کی "دھرنا پالیسی" میں ان کا بھی کسی حد تک ہاتھ تھا۔ یہ ان کے لیے زندگی کی آخری خوش گوار خبر تھی۔

مولانا مرحوم عمومی طور پر عالم اسلام اور خاص طور پر پاکستان کے اندر اسلامی تحریکوں کی کامیابی اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ تاہم چترال کے مخصوص مسائل اور چترال کے اندر دعوت دین اور تحریک اسلامی کے کام پر ان کی خصوصی نظر تھی۔ چترال کی اسلامی شناخت سے انھیں خاص لگاؤ اور

شغف تھا۔ چترال کی تین الگ تھلگ وادیوں میں بسنے والے غیر مسلم کیلاش قبیلے کے جائز حقوق کا خیال رکھتے ہوئے چترال کے مرکزی قصبے میں جشن کے نام سے کیلاش لڑکیوں کے کھلے عام رقص کے خلاف انھوں نے منظم جدوجہد کر کے بے حیائی اور فحاشی کے اس دروازے کو بند کیا۔ اس غرض کے لیے انھوں نے ۱۹۷۶ میں مرشد چترال حضرت مولانا محمد مستجابؒ کی سرپرستی میں "انجمن تحفظ عصمت چترال" قائم کی۔ اور اس پلیٹ فارم سے کیلاش قبیلے کے سرکردہ رہنماؤں کو اس بات پر قائل کیا کہ ان کی بستی کے اندر قدیم دستور کے مطابق تہواروں پر اور خوشی' غمی کے موقع پر جو رقص و سرود ہوتا ہے وہ ان کی ثقافت کا حصہ ہے' مگر افسروں اور وزیروں کو خوش کرنے کے لیے اپنی عورتوں کو نمایش گاہ میں لے جانا' ان کی غیرت کے لیے چیلنج ہے اور یہ ان کی غربت اور جہالت و ناداری کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ چنانچہ انتظامیہ کو پھر ایسی حرکت کی جرات نہ ہوئی۔

مولانا کا علمی مقام بہت بلند' ان کا مشرب بہت وسیع اور ادبی ذوق بے حد شستہ تھا۔ تفسیری مباحث اور فقہی مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ فن حدیث میں انھیں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ جدید سائنسی انکشافات سے قرآن و حدیث کے بیان کردہ حقائق کی جس طرح تصدیق ہوتی ہے' اس پر مولانا کی خصوصی نظر تھی۔ فن خطابت میں پرزور لہجے کے قائل تھے۔ بات دو ٹوک کہتے تھے جو پرتاثیر ہوتی تھی۔ اور "از دل خیزد بردل ریزد" کا اثر رکھتی تھی۔ تقریر میں دلائل و براہین کے انبار لگا دیتے' آیات مبارکہ' احادیث شریفہ' آثار صحابہ' نظائر اور بصائر کو حسب حال اور موقع محل کی مناسبت سے اپنے خطبے میں موتیوں کی لڑی کی طرح پرونے کا فن انھیں خوب آتا تھا۔ جس موضوع پر بولتے اس کا حق ادا کر دیتے۔ عربی' اردو' پشتو اور مادری زبان کھوار میں بولنے پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اپنے فن خطابت سے بپھرے ہوئے ہجوم کو مسخر کر لیتے تھے۔ ان کی علمی تربیت اور فکری نشوونما' پرورش و پرداخت' زمانے کی دو مایہ ناز ہستیوں کے زیر اثر ہوئی تھی۔ اس لیے شیخ القرآن حضرت مولانا محمد طاہرؒ سے انھوں نے فنا فی اللہ ہو کر توحید کی ترویج و اشاعت اور بدعات کے رد کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جان نثاری کا سبق سیکھا۔ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے انھوں نے عصر حاضر میں اسلام کے عادلانہ سیاسی' سماجی اور اقتصادی و تعلیمی نظام کو نافذ کرنے کے لیے باطل کی قوتوں سے پورے زور اور تمام تر طاقت کے ساتھ ٹکراتے ہوئے جان کی بازی لگانے کا سلیقہ پایا۔ قدیم و جدید کے اس حسین امتزاج نے آپ کو شرک و بدعت' سوشلزم' کیمونزم' سرمایہ دارانہ نظام' الحاد' بے دینی' اسلام دشمنی اور تمام استحصالی قوتوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کا بے پناہ حوصلہ دیا تھا۔ اس لیے ابتلاء و آزمایش کی مشکل سے مشکل گھڑی میں بھی ان کے پایہ استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ راہ حق میں آپ کو قید و بند کی صعوبتوں سے بھی واسطہ پڑا۔ ۱۹۷۶ میں چترال کے اندر کیلاش لڑکیوں کے کھلے عام رقص اور جشن کے نام پر فحاشی پھیلانے کے خلاف تحریک کی پاداش میں گرفتار ہوئے۔ ۱۹۷۷ میں پی۔این۔اے کی احتجاجی

تحریک کے نتیجے میں پابند سلاسل کیے گئے۔ ۱۹۸۲ میں چترال کے اندر فرقہ وارانہ کشیدگی کے دوران پس دیوار زندان بھیج دیے گئے۔ ۱۹۹۴ میں بے نظیر بھٹو کے دورہ چترال کے موقع پر وزیراعلیٰ سرحد کو زدوکوب کرنے کے جرم میں کمانڈو فورس نے آپ کو گرفتار کر کے حبس بے جا میں رکھا۔

مولانا عبدالرحیم چترالی کو پارلیمانی سیاست کا تجربہ زندگی کے آخری عشرے میں ہوا۔ وہ ۵۱ برس کی عمر میں رکن پارلیمنٹ منتخب ہوئے اور عمر عزیز کے آخری تین سال اس بت کدے میں اذان دیتے ہوئے گزارے۔ آپ نے اس حیثیت میں ایوان کے اندر سرگرم و فعال کردار ادا کیا۔ ایوان کی کارروائی میں آپ نے بھرپور حصہ لیا۔ تحاریک التوا، تحاریک استحقاق، توجہ دلاؤ نوٹس، نشان دار و غیرنشان دار سوالات کے علاوہ پوا ئنٹس آف آرڈر پر بولتے ہوئے آپ نے حکومت کا ہمیشہ بھرپور تعاقب کیا۔ نشہ اقتدار میں بدمست وزرا اور حکومتی پارٹی کے دیگر اراکین کے ساتھ آپ کی نوک جھونک اکثر اخبارات میں آتی رہتی تھی۔ ہر موقع پر مخالفین کی برمحل گرفت کرنے اور آواز اٹھانے میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اسلامی عقائد، شعائر اسلام، وطن عزیز کی سالمیت، اللہ جل شانہ کی حاکمیت، اور ملکی نظام حکومت کے بارے میں خلاف شرع بات کو وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مولانا کی بذلہ سنجی، حقیقت پسندی، صاف گوئی اور جرات مندی کی وجہ سے حزب اختلاف اور حزب اقتدار کے معتدل مزاج اراکین آپ کی بے حد قدر کرتے تھے۔ صحافتی حلقوں میں بھی آپ کی بے حد قدر و منزلت تھی۔

آپ کی حق گوئی کی پاداش میں بے نظیر حکومت نے آپ کے حلقے میں ترقیاتی کام رکوا دیے۔ اس پر آپ نے اگست ۱۹۹۵ میں اس ظلم اور امتیازی سلوک کے خلاف حلقہ کے عوام کو ساتھ لے کر پارلیمنٹ ہاؤس تک پرامن مارچ کیا اور ارکان پارلیمنٹ کے توسط سے سپیکر کو عرض داشت پیش کی۔ مگر حکومت کے غیرجمہوری طرز عمل میں سرمو فرق نہیں آیا۔ حلقہ انتخاب کے عوام نے بڑے بڑے جلسوں میں ہاتھ اٹھا کر آپ کو اختیار دیا تھا کہ عزت و ناموس اور ضمیر و خودی کا سودا کر کے ترقیاتی فنڈ لینے کے بجائے غیرت و حمیت کی پاسداری کر کے زنانہ، حکومت اور "باطل قوت" کے خلاف ڈٹ جائیں۔ چنانچہ اپنے ضمیر اور عوام کی توقعات کے مطابق آخر دم تک اس محاذ پر ڈٹے رہے۔

رزم حق و باطل میں فولاد کی طرح مضبوط کردار کا مالک ہونے کے باوصف حلقہ یاراں میں وہ بریشم کی طرح نرم تھے۔ طبیعت میں گداز تھا۔ مزاج میں شگفتگی اور فطرت میں بذلہ سنجی تھی۔ وہ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کی زندہ تصویر تھے۔ نکتہ آفرینی ان پر ختم ہوتی تھی۔ بات سے بات پیدا کرنے میں یکتا تھے اور ذو معنی الفاظ کے استعمال سے بات کو جامع بنانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ صاحب مطالعہ احباب کو آپ کی صحبت میں صحیح معنوں میں لطف آتا تھا۔ آپ کے استاذ گرامی مفتی محمد یوسفؒ آپ کے مدرسے میں پڑھاتے اور اکثر آپ کی مجلس میں تشریف فرما ہوتے۔ آپ ان کی بے حد عزت و تکریم کرتے اور وہ آپ کی گفتگو کا

لطف اٹھاتے۔ ایک بار ایک عرب مہمان بھی مجلس میں موجود تھا۔ رات گئے دیر تک کھوار اور پشتو میں باتیں ہوتی رہیں۔ باتوں باتوں میں فرمانے لگے، آؤ، کتاب مرتب کرتے ہیں جس کا نام ہو: کتاب امزجۃ الاصدقاء محفل میں شریک علما نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق دوستوں کے مزاج کے حوالے سے عربی کے نامانوس جملے کہے۔ آپ نے ہر ایک کو داد دی۔ پھر ہر دوست کے بارے میں آیات قرآنی، احادیث مبارکہ اور عربی مثال کی مدد سے جانے پہچانے الفاظ میں ایسے ایسے برجستہ اور برمحل جملے کہے کہ حاضرین عش عش کر اٹھے۔ کسی کے مزاج کو "عذب فرات" کہا، کسی کو "ملح اجاج" قرار دیا، کسی کو اکل و شرب کا پہلوان ٹھہرایا اور کسی کو حرب و ضرب کا مرد میدان کہا۔ الغرض سب کو ان کے مزاج اور افتاد طبع کے مطابق مقبول اور معروف نام دیے۔ محفل زعفران زار بن گئی۔

آپ کے مشرب کی طرح آپ کا دستر خوان بھی بڑا وسیع تھا۔ پوری عمر سوچ سمجھ کر مجرد زندگی گزاری۔ بھتیجوں اور بھانجوں کو اولاد کی طرح پالا۔ ہزاروں شاگردوں اور لاکھوں مداحوں کو اعزہ و اقربا کے ہمراہ سوگوار چھوڑ گئے۔

مولانا عبدالرحیم چترالی عمر بھر طاغوتی قوتوں کے خلاف اردو محاورے کے مطابق "بے جگری" سے لڑتے رہے۔ زندگی کے آخری ایام میں مرض الموت کی تشخیص ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان کے جگر میں موذی مرض نے گھر کر لیا تھا۔ اور وہ محض محاورتاً نہیں، فی الواقع "بے جگری" سے یہ چومکھی لڑائی لڑ رہے تھے۔ اس عالم میں بھی وسط ستمبر تک سرگرم و فعال رہے۔ پھر صاحب فراش ہوئے۔ وفات سے پہلے کاغذ، قلم منگوا کر اوپر کلمہ طیبہ اور نیچے "اسلام" اپنے ہاتھ سے لکھا۔ یوں دنیا میں آنکھ کھولتے ہی اذان محمدیؐ کی صورت میں پہلی بار جو الفاظ آپ نے سنے تھے، راہی ملک عدم ہوتے ہوئے آنکھیں بند ہونے سے پہلے وہی الفاظ آپ کی آخری تحریر میں آئے اور آنکھیں بند ہونے تک پیش نظر رہے۔ اور آپ نے اسی ورد و ذکر کی کیفیت و حالت میں جان عزیز، جان آفرین کے سپرد کی۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

رسائل و مسائل

اقدار اور ازدواجی زندگی

میری شادی کو تقریباً پندرہ سال ہوئے ہیں۔ میرے شوہر اعلیٰ تعلیم اور ملازمت کے لیے یورپ اور کینیڈا میں رہے۔ آج کل وہ ایک خلیجی ریاست میں شاہی خاندان سے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔ دورانِ ملازمت' میں ان کے ساتھ رہتی رہی۔ یورپ میں' میں نے محسوس کیا کہ پاکستان سے باہر رہ کر ہمارا ایمان' مشرقیت' پاکستانیت برقرار نہیں رہ سکتی۔ میں اپنے خاوند کو نہایت تاکید سے پاکستان میں رہایش پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ لیکن وہ نہیں مانتے۔ ہمیں شاہی خاندان کی طرف سے جو سہولتیں دی گئی ہیں' ان کے بارے میں لوگ پاکستان میں سوچ بھی نہیں سکتے لیکن وہاں جس سوسائٹی میں ہم اٹھتے بیٹھتے ہیں' اس کو کافی عرصے تک میں نے شوہر کے لیے برداشت کیا۔ لیکن مزید وہاں ٹھہرنا' میں اپنے لیے اور ہماری بیٹی کے لیے گوارا نہیں کر سکتی۔ لیکن میرا شوہر میری ہر خواہش تو مانتا ہے لیکن خلیجی ریاست چھوڑ کر پاکستان میں رہنا اسے کسی طور قبول نہیں۔ دو سال پہلے میں اس سے روٹھ کر مستقل پاکستان آگئی۔ تو بھی میرے خاوند نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ فون کرتا رہا' دو بار ملنے بھی آیا' جتنی رقم کی ضرورت ہوتی' اس سے زیادہ بھیجتا رہا' کہ ٹھیک ہے' آپ یہاں ضرور رہیں' میں وہاں خوش ہوں۔ چھٹیاں ہوئیں' تو انھوں نے ہمیں سیر کے لیے بلایا۔ ہم چند ہفتے وہاں ٹھہرے۔ اس بار ہماری بیٹی بھی میرے ساتھ نہ آئی۔ اس نے بھی تقریباً پاکستان چھوڑ دیا۔

اب پورے گھر میں' میں اکیلی رہتی ہوں۔ بڑا گھر' گاڑی' نوکر' خرچہ' ہر چیز میسر ہے۔ میرا خاوند اور میری بیٹی مجھے پاکستان سے باہر بلا رہے ہیں اور میں ان کو یہاں۔ نہ وہ مانتے ہیں نہ میں۔

لیکن اس معاشرے میں' ایک خاتون اکیلے گھر میں کب تک ٹھہرے گی۔ مختلف قسم کے مسائل کا میں کیسے اور کب تک سامنا کروں گی۔ شاید میں بھی مجبوراً اس معاشرہ میں ایک دن واپس چلی جاؤں' جس کو میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔ جہاں اسلام نہیں' بے حیائی ہے' عریانی ہے۔ جہاں اقدار نہیں' رشتے نہیں' ڈانس' شراب اور فحاشی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس طرح وہاں کے پاکستانیوں اور مسلمانوں کی طرح میں بھی اسے آہستہ آہستہ قبول کر لوں گی۔

میں یہاں رہوں یا باہر، براہ کرم میری رہنمائی کریں کہ میں دین اسلام، اپنے خدا اور رسولؐ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کروں تاکہ عقیدہ مضبوط ہو۔ میں ایک عام مسلمان لڑکی ہوں۔ میری کوئی دینی تربیت نہیں ہوئی ہے۔ میں اپنے دین اور ملک کو اس لیے نہیں چاہتی کہ میری کوئی نظریاتی تربیت ہوئی ہے بلکہ اس لیے کہ باہر رہ کر اور خود دیکھ کر مجھے اس لادین معاشرہ سے نفرت ہو گئی ہے۔

آپ کو اللہ کی نافرمانی سے بچنے اور اپنے ایمان، مشرقیت اور پاکستان کو برقرار رکھنے اور اپنی بیٹی کی حفاظت و تربیت کی جو فکر ہے وہ اللہ کی آپ پر بہت بڑی مہربانی ہے۔ اس جذبے کی قدر کیجیے اور اسے کبھی نہ کم ہونے دیں نہ ضائع۔ جو اللہ کی طرف رخ کریں، اللہ نے ان کو اپنی طرف چلانے کا وعدہ کیا ہے۔ اس میں آپ کے لیے بشارت ہے۔

اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا ہی آپ کا مقصد ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے جہاں عزم اور کوشش ضروری ہے، وہاں حکمت بھی ضروری ہے۔ ویسے دین کا راستہ بہت آسان ہے۔

پہلے، ایک اہم اصول آپ یہ سامنے رکھیں کہ جب دین کے مختلف تقاضوں کے درمیان موافقت نہ ہو تو یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا بات دین میں زیادہ اہم ہے، کیا بات اللہ کو زیادہ پسند ہے، کس بات میں اس کی ناپسندیدگی کا زیادہ خطرہ ہے، کس بات میں ایمان و اسلام کے لیے خطرہ زیادہ اور حقیقی ہے، اور کس بات میں کم یا صرف اندیشہ ہے۔ پھر فیصلہ کرنا چاہیے کہ کس بات کو ترجیح دینا چاہیے۔

اب پہلی بات یہ ہے کہ ایک طرف آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ آپ اللہ کی نافرمانی کی راہ پر نہ جائیں، اور اپنے ایمان و عمل کی حفاظت کریں۔ دوسری طرف یہ ذمہ داری بھی ہے---- جو اسی ذمہ داری کا حصہ ہے---- کہ آپ دوسروں کو، اور خاص طور پر اپنے شوہر اور بیٹی کو بھی، ایمان اور عمل صالح پر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ یہ ان کا آپ پر پہلا حق ہے۔ اور یہ کام آپ، ارشاد الٰہی کے مطابق حکیمانہ اور خوبصورت طریقے سے کریں۔ تیسری طرف آپ کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ آپ اپنے گھر کو آباد رکھیں، آپ پر آپ کے شوہر اور اولاد کے جو حقوق ہیں، وہ ادا کریں۔ گھر کا ٹوٹنا اللہ تعالیٰ کو اتنا ناپسند ہے کہ طلاق کو اس نے جائز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور میاں بیوی میں تفریق کو شیطان کی سب سے بڑی فتح۔

ان ذمہ داریوں کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں تو آپ کا دل خود ہی آپ کو بتائے گا کہ آپ اپنے شوہر اور بیٹی کو اس راہ پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوئیں جو آپ کے نزدیک صحیح تھا۔ نہ صرف کامیاب نہیں ہوئیں، بلکہ اب آپ کے لیے اس کا موقع بھی نہیں، اس لیے کہ وہ الگ رہ رہے ہیں اور آپ الگ۔

دوسرے آپ گھریلو زندگی کو استوار رکھنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ تیسرے اب آپ شوہر اور بیٹی کے حقوق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ شوہر تو آپ کے حقوق ادا کر رہے ہیں، جتنا وہ کر سکتے ہیں، نان نفقہ کی حد تک۔ باقی اگر نہیں کر رہے تو علیحدگی کی وجہ سے۔ لیکن آپ ان حقوق کو ادا نہیں کر پا رہی ہیں جو شوہر کو اپنی بیوی سے مطلوب ہوتے ہیں۔ نہ اب آپ اپنی بیٹی کی تربیت کر پا رہی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ یہ سب کرنا بھی صحیح ہو۔ لیکن یہ سب کرنا ایسے ہی حالات میں صحیح ہو سکتا ہے جب ان میں سے کسی بات کو کرنے سے اللہ تعالیٰ کی زیادہ بڑی نافرمانی ہوتی ہو، یا آپ کا ایمان ضائع ہونا تقریباً یقینی ہو۔ مثلاً اگر آپ کے شوہر آپ پر زبردستی کرتے ہوں کہ آپ بے حیائی اور عریانی اختیار کریں، ڈانس کریں، شراب پئیں، فحاشی کریں۔ لیکن آپ کے خط سے ایسا لگتا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ، آپ کے بقول، آپ کی ہر خواہش مانتے ہیں، صرف خلیجی ریاست چھوڑ کر پاکستان میں رہنا انھیں کسی طور قبول نہیں۔ جس سوسائٹی میں وہ اٹھتے بیٹھتے ہیں، اس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن وہاں کیا اور کس حد تک اللہ کی نافرمانی ہوتی ہے، یہ دیکھنا ہو گا۔ اور یہ کہ کیا وہ آپ پر زبردستی کرتے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ ضرور اس سوسائٹی میں جائیں؟ یہ بھی کہ اگر وہاں عریانی اور اختلاط ہو بھی، تو کیا آپ اپنے کو وہاں جانے کے باوجود ان چیزوں سے الگ تھلگ نہیں رکھ سکتیں؟ اور اگر آپ نہ جائیں تو کیا آپ کے شوہر آپ سے قطع تعلق کر لیں گے، ان سوالات کے صحیح جوابات آپ ہی دے سکتی ہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں۔ اگر میرا یہ احساس صحیح ہے تو میرے خیال میں آپ کو شوہر سے علیحدہ ہو کر پاکستان میں رہنے کے فیصلے پر نظرثانی کرنا چاہیے۔

دوسرے، آپ یہ غور کریں کہ آپ کا ایک بنیادی مقصد تو اپنی بیٹی کو غلط ماحول، اس کے مضر اثرات اور غلط راہوں پڑ جانے سے بچانا تھا۔ لیکن اب آپ کی بیٹی وہیں چلی گئی ہیں، اور آپ کا یہ مقصد پورا نہیں ہوا۔

تیسرے یہ کہ روٹھنا منا تو ازدواجی زندگی میں ایک تدبیر ہے اپنی بات منوانے کی۔ ایک دوسرے سے قریب ہونے کی۔ لیکن، جب آپ کے روٹھنے کے بعد بھی انھوں نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا، ملنے بھی آئے، مال بھی دیا، لیکن کہہ دیا کہ آپ یہاں خوش رہیں، میں وہاں خوش ہوں، تو اس کے معنی یہ تھے کہ آپ کے روٹھنے کی حکمت عملی ناکام ہو گئی۔ اس سے نہ صرف اس بات کا امکان ختم ہو گیا کہ آپ کبھی ان کی اصلاح کر سکیں، بلکہ ان کا یہ کہنا آپ کی ازدواجی زندگی کے لیے خطرے کا سگنل تھا۔ یہ سگنل دیکھ کر تو آپ کو فوراً "باعزت طریقے سے من جانے" کی سبیل تلاش کرنا چاہیے تھی۔

چوتھے، آپ نے خود ہی محسوس کر لیا ہے کہ ایک عورت تنہا نہیں رہ سکتی، نہ اس کو رہنا چاہیے۔ یہ

خود آپ کے دین و ایمان کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے۔ ایک خطرے سے بچ کر دوسرا خطرہ مول لینا دانش مندی کی بات نہیں۔ گھر، گاڑی، نوکر، خرچ کے علاوہ بھی آپ کو شوہر کی ضرورت ہے، اور شوہر کو آپ کی۔

پانچویں یہ کہ صرف خلیجی ریاست سے آکر پاکستان میں رہنا دین و ایمان کا کوئی تقاضا نہیں۔ میں مغربی ممالک میں ۱۰ سال رہا ہوں۔ اب بھی آتا رہتا ہوں۔ ہزاروں لوگوں سے واقف ہوں جو یہاں دین و ایمان کی زندگی گزار رہے ہیں۔ میرے علم کی حد تک ان خلیجی ریاستوں وغیرہ کی حالت تو یہاں سے بہتر ہے۔ کم سے کم پاکستان سے خراب تو نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آپ اسی خلیجی ریاست میں پیدا ہو جاتیں۔ اب بھی وہاں تقریباً ۱۰۰ فی صد خواتین مسلمان ہی ہیں۔ جب شوہر کی طرف سے آپ پر بے راہ رو ہونے کا کوئی دباؤ نہیں، تو اب تو یہ آپ کا کام ہے کہ دین پر قائم رہیں اور یہ کسی بھی ماحول میں ممکن ہے۔ بلکہ اگر آپ کے شوہر بے راہ رو ہوتے تو آپ کی مزید ذمہ داری بنتی کہ آپ ان کے ساتھ رہیں اور ان کی اصلاح کی کوشش کریں۔ آخر فرعون کی بیوی، فرعون کے گھر میں بھی اپنا ایمان سلامت لے گئیں۔ حضرت نوحؑ کے گھر میں ان کی بیوی کافر رہی۔ قرآن مجید نے یہ مثالیں انھی باتوں کو سمجھانے کے لیے دی ہیں۔

اس لیے میری رائے میں تو آپ فوراً شوہر کے پاس جانے کی سبیل پیدا کریں۔ 'باعزت طور پر من کر' واپس آنے کا راستہ نکال سکیں تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ صاف اپنی غلطی کا اعتراف کر کے واپس چلی جائیں کہ میں بہت الگ رہ لی، اب آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ہاں، محبت اور نرمی سے، سودا بازی کے انداز میں نہیں، یہ واضح کر دیں کہ آپ اللہ اور رسولؐ کے احکام پر قائم رہیں گی۔ اس میں بھی آپ اصولی احکام اور جزئی و فروعی احکام میں فرق کریں۔ میں خط میں تفصیل تو بیان نہیں کر سکتا، لیکن آپ خود فیصلہ کر سکیں گی کہ کن امور کی خاطر ان کی ناراضگی مول لینا چاہیے یا ان سے دوری اختیار کرنا چاہیے، اور کن امور پر آپ ان کی اصلاح اور دل جیتنے کی نیت سے کچھ خلاف ورزی کر لیں گی تو امید ہے اللہ تعالیٰ آپ کو مغفرت سے نوازے گا۔ لیکن اللہ اور رسولؐ کے واضح حکم ان امور کے دائرے میں نہیں آسکتے۔

آپ نے اسلام اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی مرضی کا علم حاصل کرنے کے لیے جس پیاس کا اظہار کیا ہے وہ بہت قابل تعریف ہے۔ اس مقصد کے لیے: (۱) قرآن سمجھ کر باقاعدہ پڑھیں۔ اور وقت ہو تو تفہیم القرآن ایک سلسلے سے پوری پڑھ لیں۔ (۲) دوسرے کچھ وقت قرآن کے وہ حصے جو آخرت و توحید سے متعلق ہیں مثلاً سورۃ یٰسین سے آخر قرآن تک--- ویسے ہی سمجھ کر رو رو کر پڑھیں۔ (۳) تیسرے حدیث و سیرت کا مطالعہ کثرت سے کریں۔ اس طرح کریں جیسے آپ حضورؐ کی مجلس میں ہیں۔ اس طرح آپ کو دین کے مزاج اور حکمت کا صحیح علم ہو گا۔ احادیث سے احکام کا استنباط نہ کریں۔ مطالعہ حدیث کے لیے "راہ عمل" مفید رہے گی۔ (۴) دینی کتب میں سے مولانا مودودیؒ کی (خاص طور پر خطبات، شہادت حق، رسائل و

مسائل اور دیگر)۔ اس کے علاوہ آپ کے اعزہ و اقربا بھی آپ کو بتا سکیں گے۔ کتابوں کی دکان کے چکر لگائیں، جو کتاب اچھی لگے وہ خرید لیں۔ لیکن شروع میں مصنف کے بارے میں کسی سے پوچھ لیں۔

علم سے زیادہ یقین کی ضرورت ہے، ذکر کی ضرورت ہے۔ دعائیں خوب مانگیں۔ اللہ کو خوب یاد رکھیں۔ خصوصاً اس بات کو کہ اس سے ملاقات کرنا ہے اور ہر کام اسی لیے کرنا ہے کہ اس ملاقات کے وقت رسوائی نہ ملے، سرخ روئی نصیب ہو۔

عمل میں ہر کام اللہ کی خوشنودی اور جنت کی خاطر کرنا سیکھیں۔ دوسرے، اللہ کی نافرمانی سے بچیں۔ تیسرے، کسی انسان کو اپنے سے ایذا نہ پہنچائیں۔ جتنی خدمت کر سکیں وہ کریں۔ انسانی تعلقات میں بگاڑ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو کوئی بات زیادہ ناپسند نہیں۔ جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹنا، سب سے بڑے گناہوں میں سے ہے۔ اور جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے جوڑنا، سب سے بڑی نیکیوں میں سے ہے۔

آپ کے حالات دیکھ کر دل بے چین ہوا کہ آپ کا جذبہ صحیح راہ لگ جائے۔ اسی لیے اپنی خرابی صحت کے باوجود اتنا طویل خط لکھ دیا۔ امید ہے آپ ان باتوں پر عمل کریں گی۔

(خرم مراد)

یہ حساب ضرور دینا ہے:

تم نے اپنا مال کہاں خرچ کیا؟

ہم جو شادی بیاہ پر' نام و نمود پر' آرام و آسائش پر'
کھلے دل' کھلے ہاتھ اور کھلی جیب سے خرچ کرتے ہیں

کبھی سوچا؟
اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت ہاتھ تنگ کیوں ہو جاتا ہے!
ضرور ہم روز حساب اپنی پیشی بھول جاتے ہیں۔

سارے عیش آخری آنے والی سانس تک ہیں
پھر تو آخرت کے عیش کے علاوہ کوئی عیش نہیں۔

اس عیش کی سب سے آسان ضمانت'

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور خوب خوب خرچ کرنا ہے۔

۱۵' ۲۰ فی صد کے منافع کے لیے' ہمارے پاس مال ہی مال ہے
اور ۷۰۰ گنا کے لیے؟ (ہمارے ایمان کو کیا ہو گیا ہے!)

رمضان کا مہینہ' خصوصی سرمایہ کاری کا مہینہ ہے'
اسے غفلت میں' آخری عشرے' آخری دن کے انتظار میں نہ گزار دیں۔
جتنا ممکن ہو سکے' انفاق فی سبیل اللہ کی مد میں جلد جمع کروا دیں'
اور روز حشر مصیبت کے وقت وصول کر لیں۔
اور دنیا میں بھی خیر و برکت کا مشاہدہ کریں۔

(بندہ خدا)

کتاب نما

عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال، اسرار عالم۔ ناشر: قاضی پبلی شرز، دہلی۔ صفحات: ۲۵۵۔ قیمت: درج نہیں۔

زیر نظر معلوماتی کتاب سے مصنف کے مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مگر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کتاب کا اصل موضوع کیا ہے؟ کتاب میں عالم اسلام اور عالم عیسائیت کی تاریخ کے وہ سب واقعات بیان کیے گئے ہیں جو مصنف کے خیال میں یہودی سازشوں کا نتیجہ تھے۔ ان کے خیال میں قدیم دور کے بہت سے، اور جدید دور کے تقریباً سب اہم واقعات کسی نہ کسی "یہودی سازش" کا نتیجہ ہیں۔ اس حوالے سے کتاب میں ایشیا اور یورپ کی گذشتہ ہزار سالہ تاریخ کا اچھا خاصا خلاصہ آگیا ہے۔ یہ تاریخی جائزہ انگریزی، عربی، فارسی، لاطینی، فرانسیسی اور جرمن کتب کے مستند حوالوں سے مزین ہے۔ معلومات کے اس ذخیرے کو "عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال" کا عنوان دینے کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ مصنف کے خیال میں عالم اسلام کی موجودہ اخلاقی ابتری کی اصل وجہ داخلی نہیں خارجی ہے، یعنی یہودی سازشیں۔ اس توجیہ کے حق میں عقلی دلائل دینے کے بجائے مصنف نے مبینہ یہودی سازشوں کی ایک طویل داستان سنانے کو ترجیح دی ہے۔

یوں کتاب کا اصل موضوع عالم اسلام اور عالم عیسائیت کے خلاف یہودی ریشہ دوانیوں کا بیان ہے، اور کتاب کی قدر و قیمت بھی اسی حوالے سے بنتی ہے۔ خصوصاً عقلیت، انسانیت، ترقی اور فیشن کے خوبصورت لبادوں میں سیکولرائزیشن کا عمل جس طرح آگے بڑھایا جاتا رہا ہے، مصنف نے اس کا پول کھول دیا ہے۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ ان حوالوں سے پیش کیے جانے والے افکار اتنے "معصوم" اور "بے ضرر" نہیں ہوتے جتنے اکثر جدید تعلیم یافتہ افراد خیال کرتے ہیں۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد کی چند صدیوں کے دوران یہودی، مسلمانوں کو عقلیت کے نام پر سیکولرائز کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر ناکامی ہونے پر انھوں نے پہلے عیسائیوں اور پھر منگولوں کو عالم اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے پر آمادہ کیا۔ پھر انھوں نے مغربی یورپ کو سیکولرائز کرنے کی کوشش کی۔ مصنف کے خیال میں یورپ اور امریکہ کی موجودہ ترقی عالم عیسائیت کے خلاف یہودی سازشوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اس فطری سوال کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہ کیسی "سازش" ہے جس نے یہودیوں کے دشمنوں --- یعنی عیسائیوں --- کو مادی

ترقی سے ہم کنار کیا، قانون کی حکمرانی کا علم بردار بنایا اور نظم و ضبط اور سلیقہ سکھایا۔ دراصل مصنف مادی ترقی وغیرہ کو بالکل ہی درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک اصل اہمیت صرف اور صرف اس بات کی ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں یورپ اپنے روحانی سرمائے سے محروم ہو گیا، اور بقول مصنف: یہ یہودیوں کا عیسائیوں سے انتقام تھا!

کتاب کے آخری حصے میں یہ بحث کی گئی ہے کہ روحانیت سے تہی دامن جدید مغرب یہودیوں کا کارندہ بن کر کس کس طرح عالم اسلام کو بھی اس کے روحانی ورثے سے محروم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ خاتمہ کلام میں مصنف نے اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ "اب روئے ارض پر خلافت اسلامیہ کی بحالی دور نہیں!"

کتاب میں انسانی تمدن کی ہر ترقی کو یہودی سازش قرار دینے کا رجحان نمایاں ہے۔ مصنف عقلیت، سائنس اور بزنس (تجارت) کا ذکر بھی بطور ایک یہودی سازش کے کرتے ہیں۔ یوں سائنس بیزاری میں وہ سید حسین نصر، ضیاء الدین سردار اور پروفیسر عبدالقدیر سلیم کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک اصلاح بھی ان کے خیال میں سیکولرائزیشن کی توسیع کے عمل کا حصہ تھی۔

یہ کتاب اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود مندرجہ ذیل خامیوں کے باعث کسی نئے فلسفہ تاریخ کی بنیاد رکھنے میں ناکام رہے گی:

۱۔ اس کتاب میں عالم اسلام اور عالم عیسائیت میں پھیلائی جانے والی مختلف گمراہیوں کا تذکرہ تو ہے، مگر اس بات کا جائزہ لینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ وہ کون سے داخلی رجحانات تھے جن کے باعث مختلف اقوام نے مذکورہ خیالات کو متعلقہ ادوار میں پذیرائی بخشی۔ مثلاً مصنف لوتھر اور کالون کے ہاتھوں برپا ہونے والی یورپ کی تحریک اصلاح مذہب (Reformation) کی تاریخ بیان کرنے کے بعد اسے یہودی سازش قرار دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی نے اپنی کتاب "مذہب اور تجدید مذہب" میں بھی تحریک اصلاح مذہب پر بھرپور تنقید کی ہے۔ مگر اسرار عالم صاحب کے برعکس صدیقی صاحب خارجی کے ساتھ ساتھ داخلی عوامل کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "مذہبی طبقوں کی دنیا پرستی (اور بے دانشی) نے کلیسا اور خانقاہوں کی حالت کو اخلاقی اور دینی اعتبار سے کافی حد تک تباہ کر دیا تھا، اور صورت حال کی اصلاح ناگزیر تھی۔ لیکن لوتھر کے ہاتھوں اصلاح مذہب کی جو تحریک اٹھی اس نے حالات کو سنوارنے کے بجائے انھیں مزید خراب کیا"۔ ہو سکتا ہے اسرار عالم صاحب لوتھر کو یہودیوں کا ایجنٹ سمجھنے میں حق بجانب ہوں، مگر صورت حال کا تجزیہ کرنے میں انھیں یہ بات نظرانداز نہیں کرنی چاہیے تھی کہ اس وقت عیسائیت میں اصلاح کی ایک فطری طلب بہرحال موجود تھی، اور اگر یہ اصلاح یہودی ایجنٹ نہ بھی کرتے تو کوئی اور کرتا۔ اسی طرح عالم اسلام کے خلاف جن یہودی سازشوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ تو جراثیم کی طرح ہیں، مگر اصل سوال یہ ہے کہ عالم اسلام کی مدافعاتی قوت رفتہ رفتہ اتنی کم کیوں ہو گئی کہ یہ جراثیم مسلمانوں کا اخلاق تباہ کرنے

میں کامیاب ہو گئے۔ یہ سوال اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ مصنف نے خود اس بات پر بہت زور دیا ہے (ص ۳۱) کہ ایک وقت میں عالم اسلام کی یہ مدافعاتی قوت اس قدر تھی کہ یہودی تین سو سالہ کوششوں کے بعد ناکام ہو کر عالم اسلام سے بھاگنے پر مجبور ہوئے۔

۲۔ نتیجہ تاریخ کے طور پر یہ بات منوانا بڑا مشکل ہے کہ "یہودی کسی ایک کمرے میں بیٹھ کر کی گئی منصوبہ بندی کے مطابق سیکڑوں سال تک یورپ کو ایک مرکز سے کنٹرول کرتے رہے ہیں"۔ اس قسم کے دعویٰ کو ثابت کرنے کی' مصنف کی کوششوں' کی ناکامی کی مثال یہ ہے کہ صفحہ ۳۷ پر وہ یہ مشہور خیال پیش کرتے ہیں کہ موجودہ عیسائیت کا حقیقی بانی سینٹ پال ایک ایسا یہودی تھا جس نے دانستہ عیسائیت کو غلط رخ پر ڈالا۔ مگر صفحہ ۶۰ پر وہ بتاتے ہیں کہ پندرھویں صدی عیسوی میں یہودیوں نے اسی سینٹ پال پر رکیک حملوں کو رواج دیا۔ اگر یہودیوں کی منصوبہ بندی اتنی ہی سوچی سمجھی تھی تو آخر انھوں نے اپنے ہی ایجنٹ پر اس طرح تنقید کیوں کی؟ ـــــ یہودیوں کے فتنہ پرداز مزاج کو سامنے لانا بے شک مصنف کا ایک کارنامہ ہے' مگر اس قوم کی صلاحیتوں کو مافوق الفطرت قرار دینے کے لیے ان کے پاس کافی دلائل نہیں۔ (ڈاکٹر بلال محمود)

اردو' سرکاری زبان' چودھری احمد خان (علیگ)۔ ناشر و مصنف' ۴۸۳' این سمن آباد' لاہور۔ صفحات: ۲۶۰۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

پاکستان' اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا' مگر "اسلامی جمہوریہ پاکستان" میں انفرادی و اجتماعی اور نجی و سرکاری و حکومتی سطح پر اسلام کے ساتھ افسوس ناک سلوک روا رکھا گیا' یہ ایک دردناک داستان ہے ـــــ حصول پاکستان کے مقاصد کے حوالے سے دوسری دکھ بھری کہانی اردو زبان کی ہے۔ قائداعظم نے اپنی تقریروں میں بارہا زور دے کر اعلان کیا کہ "پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی" مگر قائداعظم کے جانشینوں اور پچاس سال میں' وطن عزیز کے اقتدار و اختیار پر قابض سیاست دانوں اور افسروں نے اردو زبان کے بارے میں قائداعظمؒ کے ارادوں کو ناکام بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ زیر نظر کتاب پاکستان میں اردو زبان کی ترویج و نفاذ کی یہی دردناک داستان پیش کرتی ہے۔

چودھری احمد خان (پ: ۱۹۲۰) ۱۹۸۰ میں ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ وہ ایک طویل عرصے سے نفاذ اردو کے لیے کوشاں چلے آ رہے ہیں۔ ۱۹۷۳ کے آئین پاکستان میں طے کیا گیا تھا کہ ۱۴ اگست ۱۹۸۸ تک اردو کو سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت سے رائج کر دیا جائے گا مگر "خوے بدرا بہانہ ہاے بسیار"۔ آئین کے آرٹیکل ۲۵۱ (ا) کی مسلسل خلاف ورزی ہو رہی ہے اور نفاذ اردو کا خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے۔ ہماری ذہنی' تعلیمی' علمی' سائنسی اور انتظامی پس ماندگی کا ایک اہم سبب انگریزی زبان کے

بہ ہر اعتبار بے جواز تسلط کا ہے۔ قومی زبان کو اس کا جائز آئینی حق دلانے کے لیے، چودھری احمد خاں صاحب نے، ڈاکٹر سید اسعد گیلانی مرحوم کی اعانت و رفاقت میں اور جناب ارشاد احمد قریشی ایڈووکیٹ کی رہنمائی میں اپنا بہت سا قیمتی وقت صرف کر کے کئی ماہ کی محنت شاقہ کے بعد ۳۸۵ صفحات پر مشتمل آئینی درخواست تیار کی اور اکتوبر ۱۹۸۸ میں اسے سپریم کورٹ میں داخل کیا۔ مذکورہ آئینی درخواست کے عدالتی سانچے کو بدل کر، حذف و اضافوں اور بعض ترامیم کے بعد، اسے زیر نظر کتاب کا باب اول بنا دیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اردو زبان سے متعلق علمی، تعلیمی اور لسانی معلومات اور مباحث شامل ہیں، مثلاً غیر ممالک میں اردو، اردو میں اصطلاحات، پہلی جماعت سے لازمی انگریزی تدریس، اردو یونی ورسٹی، علامہ اقبال اور انگریزی تعلیم، مقتدرہ قومی زبان اور اس کی مطبوعات، اردو زبان اور ہمارے تعلیمی کمیشن، قومی اسمبلی میں اردو بل، افواج پاکستان اور اردو، اردو سرکاری زبان بنوانے کے لیے ہم کیا کریں؟ وغیرہ۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر بیش قیمت معلومات کا ایک خزینہ ہے۔ یوں سمجھیے اردو زبان، خصوصاً نفاذ اردو سے متعلق جملہ امور کا ایک دائرہ معارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے۔

اس کتاب سے بہت سی دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں، مثلاً مقتدرہ قومی زبان کے ایک جائزے (۱۹۸۸) کے مطابق گریڈ ۲۰ سے اوپر والے سرکاری افسروں میں سے کسی کا بیٹا یا بیٹی اردو میڈیم سکول میں نہیں پڑھتے۔ گریڈ ۲۱ سے اوپر والے افسران کی بیگمات نے ذریعہ تعلیم کے بارے میں کہا: یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے ہماری اولاد تو امریکہ، برطانیہ اور دوسرے ممالک میں پڑھ کر برسر روزگار ہو چکی ہے (ص ۳۰۸)۔ ہماری ذہنی غلامی (اور اس کے نتیجے میں شدید احساس کمتری کے مقابلے میں) زندہ قومیں، اپنی شناخت کو برقرار رکھنے کا اہتمام کرتی ہیں، مثلاً فرانس میں، ایسے انگریزی الفاظ کے استعمال پر قانوناً پابندی ہے جن کے متبادل فرانسیسی موزوں الفاظ موجود ہیں۔ خلاف ورزی پر ساڑھے تین ہزار ڈالر جرمانے کی سزا ہے۔ پابندی لگنے والے الفاظ میں روز مرہ بول چال کے "برگر" "کوکا کولا" اور "فاسٹ فوڈ" جیسے الفاظ بھی شامل ہیں۔ فرانس کے وزیر قانون نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس قانون کا مقصد فرانس کی ثقافت اور زبان کو غیر ملکی یلغار سے بچانا ہے (ص ۳۰۹)۔ حال ہی میں خبر آئی ہے کہ ایران نے بھی اپنے ہاں ایسا ہی ضابطہ بنا لیا ہے۔ اب ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے کہ ایک نوجوان چین سے اردو سیکھنے پاکستان آیا۔ ایک سال بعد وطن لوٹتے ہوئے اس نے کہا کہ میں نے پاکستان میں رہ کر اردو کے مقابلے میں انگریزی زیادہ سیکھی ہے۔ کیوں کہ پاکستانی مجھ سے زیادہ تر انگریزی میں گفتگو کرتے تھے۔ اس طرح میری انگریزی بول چال بہت رواں ہو گئی ہے (ص ۳۱۱)۔

چودھری احمد خاں صاحب کی مادری زبان پنجابی ہے مگر وہ قومی زبان کے نفاذ کے لیے اپنے محدود وسائل کے ساتھ اور باایں پیرانہ سالی تن من دھن سے کوشاں ہیں۔ یہ کتاب بھی انھوں نے خود شائع کی ہے۔ ان کی یہ سب کوشش کاوش و خدمت قابل داد و تحسین ہے اور ایک لحاظ سے نفاذ اردو کے لیے مولوی عبدالحق اور

ڈاکٹر سید عبداللہ کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کی ایک کڑی ہے۔ وہ سید صاحب کی نفاذ اردو تحریکوں میں بھی شامل رہے ہیں۔ ایک جگہ بتایا ہے کہ انھوں نے قومی اسمبلی سے اردو بل پاس کرانے کے سلسلے میں اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف کو کئی خط ارسال کیے مگر کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اس پر انھوں نے لکھا: "قائداعظم آپ سے زیادہ مصروفیات کے باوجود ہر کسی کو خط کا جواب فوری طور پر دیا کرتے تھے"۔ (ص ۳۹۴)۔

چودھری احمد خاں صاحب نے زیر نظر کتاب کی صورت میں ایک وقیع اور جامع دستاویز مرتب کی ہے، جو قومی زبان اردو اور پاکستان میں اس کے نفاذ کے سلسلے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

اقبالیات نذیر نیازی، عبداللہ شاہ ہاشمی ۔ ناشر: اقبال اکادمی پاکستان، ایوان اقبال، لاہور۔ صفحات: ۳۲۴۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

سید نذیر نیازی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے طالب علم اور بعدازاں وہاں معلم رہے۔۔۔ ان کی زندگی کا باقی عرصہ بھی معلمی اور تصنیف و تالیف میں گزرا۔ وہ علامہ اقبالؒ کے قریبی دوست اور رفیق تھے جنھیں بیس برس تک اقبال کی خدمت میں حاضری اور ان کے افکار سے خوشہ چینی کا موقع ملا۔ اقبال کے معروف اور اوق انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ نیازی مرحوم ہی کی کاوش تھی (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۸ومابعد)۔

عبداللہ شاہ صاحب نے اقبال پر ان کے بیس سوانحی اور توضیحی و تنقیدی مضامین کو تلاش و جمع کر کے مرتب کیا ہے۔ پہلے حصے کے سوانحی مضامین سے اقبال کی شخصیت کے بعض دلچسپ پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک جگہ نیازی صاحب لکھتے ہیں: "انھیں دیکھ کر یہ خیال نہ ہوتا تھا کہ وہ بڑے آدمی ہیں یا بڑے فلسفی یا بڑے شاعر یا بڑے سیاست دان ہیں یا بڑے مومن ہیں حالانکہ وہ سب کچھ تھے اور بہت عظیم تھے۔ وہ بہت بڑے مسلمان تھے اور تکلف و تصنع سے پاک ایسے بے ریا انسان تھے جن کا دل صرف عالم اسلام کے لیے ہی نہیں، رحمت اللعالمینؐ کے اتباع میں بنی نوع آدم کے لیے دھڑکتا تھا۔ میں نے مولانا محمد علی جوہرؒ اور علامہ اقبالؒ کی شخصیتوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب پایا۔ ان کی قوت ایمانی، جذبہ جہاد اور فکر متین۔ ہمہ وقت علامہ اقبالؒ کا ذہن اسلام اور مسلمانوں پر مرکوز رہتا تھا۔ اسلام عین حیات ہے۔ دنیا کو شر و فساد، شقاوت اور بدبختی سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسلام کی کس قدر ضرورت ہے اور اس کے لیے اسلام کی دعوت، اس کے معنی و مقصود، تعلیمات اور تشریحات کی عملاً ترجمانی، تشریح اور توضیح کی کس قدر ضرورت ہے؟ حضرت علامہ رہ رہ کر اسلام اور مسلمانوں کا ذکر چھیڑتے، رہ رہ کر کسی خیال میں ڈوب جاتے ۔۔

قراری کے عالم میں اٹھ بیٹھتے اور یااللہ کا ورد کرتے۔ اس دل سوزی اور بے قراری کے باوجود علامہ صاحب مسلمانوں کے تابناک مستقبل کے بارے میں پرامید تھے"۔ (ص ۱۸-۱۹)

ایک مضمون میں ان کی آخری علالت کے چشم دید حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ "علامہ اقبال اور مولانا مودودیؒ" میں نیازی صاحب نے اقبال سے چودھری نیاز علی کی ملاقات کا چشم دید واقعہ بیان کیا ہے کہ چودھری نیاز علی قلعہ جمال پور (نزد پٹھان کوٹ) میں اپنے وقف کے لیے مناسب و موزوں علما کی تلاش میں تھے۔ اس سلسلے میں وہ اقبال سے ملاقات و رہنمائی کے لیے "جاوید منزل" آئے اور اپنا مدعا بیان کیا۔ علامہ نے ایڈیٹر "ترجمان القرآن" مولانا مودودیؒ کا نام تجویز کیا۔ (جن کی کتاب "الجہاد فی الاسلام" وہ پڑھ چکے تھے)۔ نیازی صاحب نے اقبالؒ کے حسب ہدایت مولانا مودودیؒ کو ایک مفصل خط لکھا، بعدازاں خود چودھری صاحب نے رابطہ قائم کیا، خط کتابت ہوئی اور اس کے نتیجے میں، مولانا لاہور آکر اقبال سے ملے، بالآخر دکن سے پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے (ص ۱۰۳-۱۰۵)۔

تنقیدی حصے میں اقبالیات کے بعض اہم موضوعات پر مضامین شامل ہیں، مثلاً اقبال اور حکمائے فرنگ، خودی، اقبال کی عظمت فکر، قرآن مجید کے حقوق اور علامہ اقبال، علامہ اقبال اور ختم نبوت، اقبال اور اسلامی ثقافت کی روح، وغیرہ۔

مولف نے نیازی مرحوم کے آثار اقبالیات کی جمع و تدوین میں خاصی محنت و کاوش کی ہے۔ متن، خصوصاً اشعار کی اغلاط، قرآنی آیات کے حوالے اور آیات کے تراجم کی تصحیح کی، مضامین پر حواشی و تعلیقات فراہم کیے اور بعض اشعار کی تخریج بھی کی ہے۔ ابتدا میں "نذیر نیازی: ایک اقبال شناس" کے عنوان سے ایک مقدمہ شامل ہے، جس میں نیازی صاحب کے حالات زندگی، ان کے علمی آثار اور اقبالیات پر ان کی تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے۔۔۔۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب، غیرمدون تحریروں کی ایک مستحسن کوشش اور اقبالیات کے ذخیرے میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔ (ر - ہ)

مجلہ سیارہ (ماہنامہ)، مدیر اعلیٰ: نعیم صدیقی۔ پتہ: ایوان ادب، اردو بازار، لاہور۔ خاص شمارہ: ۴۱، ستمبر ۱۹۹۶۔ صفحات: ۲۶۴۔ قیمت: ۲۷ روپے۔

کئی ماہ کے وقفے کے بعد، "سیارہ" کا تازہ شمارہ، نئے پرانے لکھنے والوں کی بہت سی دلچسپ تحریروں کے ساتھ منظرعام پر آیا ہے۔ جناب نعیم صدیقی نے "جبریت" کو اداریے کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے خیال میں انسان اور انسان کے درمیان ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنا ادب کا فرض ہے۔ یہ رشتہ اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتا جب تک قوی آدمی ضعیف کے لیے شفقت کا رویہ اختیار نہ کرے اور ضعیف آدمی کے دل سے قوی آدمی کے جبر کا خوف دور نہ ہو جائے۔

حسب روایت، اس شمارے میں بھی حمد، نعت، غزل، مقالات، افسانوں اور طنز و مزاح کے ذیل میں عمدہ تحریریں جمع کی گئی ہیں۔ "کلام اقبال کی تدوین" (رشید حسن خان)، بشیر ساجد سے ایک گفتگو، محمود عالم قریشی کی خود نوشت، نسیم حجازی پر ایک مختصر گوشہ اور طنز و مزاح کے حصے میں پروفیسر آسی ضیائی، سلمیٰ یاسمین نجمی اور اشفاق احمد ورک کی کاوشیں خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ لطیف الزماں نے سوال اٹھایا ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے تحت دسمبر ۱۹۹۷ میں غالب پر دوسوواں جشن منانے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی ہے اس کے اراکین میں کتنے اصحاب "غالب شناس" ہیں؟ جشن کے ضمن میں انھوں نے بعض مفید تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ محمود عالم قریشی نے اپنے زمانہ معلمی (اسلامیہ کالج لاہور) کی یادداشتوں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تدریس دینیات کا ذکر کیا ہے۔ بتاتے ہیں کہ مولانا اعزازی معلم تھے اور درس و تدریس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے البتہ تانگے کا کرایہ (آٹھ آنے) کالج کے ذمے تھا۔ مولانا اپنے لیکچر میں انگریزی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ قریشی صاحب اپنا یہ مشاہدہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مولانا کالج لائبریری سے معاشیات و سیاسیات وغیرہ پر انگریزی کتابیں مطالعے کے لیے لے جاتے، بہ غور مطالعہ کرتے اور جگہ جگہ نشان لگا دیتے۔۔۔ جناب علیم ناصری نے جعفر بلوچ صاحب کی تصنیف "اقبال اور ظفر علی خان" پر تبصرے کے ضمن میں علامہ اقبال سے "ایکس شاعر" کی نظموں کے انتساب کو مشکوک قرار دیا ہے۔ انھوں نے ماہرین اقبالیات کو اس مسئلے پر تحقیق مزید کی دعوت دی ہے۔ "محفل غائبانہ" میں پروفیسر اسرار احمد سہاوری، جناب مقبول الٰہی اور جناب فضل معبود کے طویل تبصرہ نما خطوط دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔

معاصر ادب اور مختلف اصناف میں ہونے والی تازہ کاوشوں، ادبی رجحانات اور مباحث و صورت احوال سے باخبر ہونے کے لیے یہ ایک عمدہ دستاویز ہے۔ (ر - ہ)

فی ظلال القرآن، جلد چہارم۔ سید قطب۔ ترجمہ: سید معروف شاہ شیرازی۔ ناشر: ادارہ منشورات اسلامی، بالمقابل منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ صفحات: ۱۱۵۴۔ قیمت: ۳۲۵ روپے۔

سید قطب کی شہرہ آفاق تفسیر قرآن کی چوتھی جلد پیش نظر ہے۔ یہ جلد پارہ ۱۳ سے ۱۹ تک کے ترجمہ و تفسیر پر مشتمل ہے۔ پہلی تین جلدوں پر، انھی صفحات میں تبصرہ آچکا ہے۔ یہ جلد بھی، حسب سابق اچھے معیار پر شائع کی گئی ہے اور ضخامت کے مقابلے میں ہدیہ بہت مناسب ہے۔ (ر - ہ)

مدیر کے نام

ڈاکٹر طلعت سلطان ' جامعہ ام القریٰ ' مکہ مکرمہ

مشترک اجتماعات (نومبر ۹۶) پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی اور بے ساختہ آپ کے لیے دعائیں نکلیں۔ فقہی مسائل میں شدت و غلو کے خلاف قلم اٹھا کر آپ نے جماعت کی اولین تعلیمات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ سید مودودیؒ نے قیام جماعت کے وقت ہی یہ بات واضح کر دی تھی کہ یہ جماعت کسی مخصوص فقہی مسلک کی ترجمانی کے لیے بطور فرقہ قائم نہیں کی گئی ہے۔ قائدِ تحریک نے اس وقت بڑے واضح الفاظ میں کہا تھا: "ارکان جماعت کو میں خداوند برتر کا واسطہ دے کر ہدایت کرتا ہوں کہ کوئی شخص فقہی و کلامی مسائل میں میرے اقوال کو دوسروں کے سامنے حُجت کے طور پر پیش نہ کرے۔ اس طرح میرے ذاتی عمل کو بھی جسے میں نے اپنی تحقیق کی بنا پر جائز سمجھ کر اختیار کیا ہے' نہ تو دوسرے لوگ حجت بنائیں اور نہ بلاتحقیق محض میرا عمل ہونے کی حیثیت سے اس کا اتباع کریں ' ان معاملات میں ہر شخص کے لیے آزادی ہے---" (روداد جماعت ' حصہ اول ' صفحہ ۳۴)

بدقسمتی سے ہم میں سے اکثر سید مودودیؒ سے اظہار عقیدت کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ہر مسئلہ میں ان کے فقہی مسلک پر بعینہٖ صاد کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ کی زبانی تعریف کرنے کے باوجود بہت سے لوگ اپنے مسلک سے مختلف بات کو کوئی اہمیت' عزت یا احترام دینے کے قطعاً" روادار نہیں ہوتے۔

"مشترک اجتماعات" پر آپ کی بات پڑھ کر یاد آیا کہ ایک مرتبہ مانٹریال (کینیڈا) میں مولانا محترم کی یاد میں ایک تقریب سے خطاب کرنے گیا ہوا تھا۔ منتظمین نے خواتین کے لیے قناتیں تان کر الگ انتظام کیا تھا۔ اختتام اجتماع پر پاکستان کی ایک خاتون میرے پاس آئیں اور کہا کہ "بھائی جان! آپ نے کیا تقریر کی' اور کیا عمدہ باتیں کہیں' یہ تو آپ مرد حضرات ہی جانیں' ہمارے یہاں خواتین میں تو اتنا شور و غل تھا کہ کان پڑی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ڈیٹرائیٹ (مِی شی گن) میں ایک اجتماع میں جب میرے اصرار پر خواتین حجاب کے ساتھ مردوں کے پیچھے والی نشستوں پر آ کر بیٹھیں تو نہ صرف انھوں نے بات کو غور سے سنا بلکہ مردوں کی توجہ بھی پوری طرح اجتماع پر مرکوز رہی۔

ہمارے بعض احباب شاید یہ کہیں کہ یہ محض اجتماع کے نظم و نسق کا مسئلہ ہے' اسے مشترک اجتماعات کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ محض زبانی گفتگو سننے کے مقابلے میں' مشاہدہ سے توجہ کے

ارتکاز (attention span) اور مواد کے تحفظ (retention) پر ۵۰۰ سو گنا زیادہ اثر پڑتا ہے۔

رئیس فاطمہ ' نامعلوم

رشتے داروں سے پردہ (نومبر۹۶) پڑھ کر بے انتہا دکھ اور افسوس ہوا۔ مجھے آپ سے ہرگز ایسی توقع نہیں تھی۔ آپ نے نہ صرف ان خاتون کی غلط رہنمائی کی بلکہ شرعی پردے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ جہاں تک صلہ رحمی کا تعلق ہے وہ چہرے کے پردے کے باوجود کی جا سکتی ہے۔ انھیں تحائف دیے جا سکتے ہیں' کھانے پر بلایا جا سکتا ہے' ان کی بیویوں اور بیٹیوں سے تعلقات بڑھائے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک امر بالمعروف کا حکم ہے اور رشتے داروں کو ڈرانے کا حکم ہے تو عورت کے لیے عورتوں کا میدان اور مرد کے لیے مردوں کا میدان ہے۔ کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کے لیے نامحرم رشتے داروں کو تبلیغ کرنا ضروری ہے۔

پردے کے بارے میں قرآن و حدیث کے احکامات کو ملاؤں کی ایجاد قرار نہیں دیجیے گا۔ نفس کو جو چیز مرغوب نہ ہو اور اپنے گھروں میں اس کا رواج دینا مشکل نظر آئے' اسے دین میں غلو اور مشکل پیدا کرنا نہ کہیں۔ یقین کیجیے یہی آسانی ہے' یہی میانہ روی ہے اور یہی شریعت ہے کیونکہ یہی سلف صالحین کا طریقہ ہے۔

آپ کے جواب سے نہ صرف شرعی پردہ کرنے والی خواتین کی دل آزاری ہوئی جو اب تک شوہر' والدین' خاندان والوں اور سسرال والوں کے طعنے اللہ کی خاطر برداشت کرتی رہی ہیں بلکہ جو خواتین اس جدوجہد میں مصروف ہیں کہ کسی طرح اپنے نفس' شوہر' خاندان والوں اور سسرال والوں کو آمادہ کر کے نامحرموں سے پردہ کر سکیں' وہ بھی ڈھیلی پڑ گئی ہوں گی۔

حافظ محمد حسین ' تونسہ شریف

رشتے داروں سے چہرہ کا پردہ اور مشترک خاندان اور اسلام ایک نہایت اچھی کوشش ہے۔ آج کل ہر خاندان میں یہی مسائل ہیں۔ اسی طرح کی تحقیق سے بہت سی پریشانیاں ختم ہو سکتی ہیں اور دین کے صحیح تصور کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

بیگم نصرت سمیع ' جھنگ

گذشتہ چند ماہ سے ترجمان کے مضامین کی ترتیب میں ایک خاص بات خوش آیند پائی' وہ ہے اسلامی معاشرے میں خواتین کے حوالے سے مضامین کی شمولیت۔ کم از کم میں تو شکرگزار ہوں۔ دسمبر کی اشاعت میں اسفار نبویؐ میں امہاتؓ کی شمولیت پر ڈاکٹر صدیقی کا مقالہ بے حد خوبصورت تھا۔

سرفراز علی مرزا ' لاہور

قائد اعظم پبلک لائبریری میں "ترجمان القرآن" میں تزکیہ و تربیت کے موضوع پر آپ کا مضمون نظر سے گزرا' نیز کسی بہن کے سوال کے جواب میں آپ کی نگارشات پڑھنے کا موقع ملا۔ "الدین یسر" کے نقطہ نظر کو اس

قدر وضاحت سے اور دل نشیں پیرایہ میں بیان کرنے پر مبارک باد قبول فرمایئے۔

خالد محمود ' سرگودھا

"اپنی تربیت کیسے کریں" زبردست مضمون ہے۔ تربیت کے حوالے سے میری بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ اللہ آپ کو یہ کتاب مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

محمد ہارون مومن ' کراچی

نومبر ۹۵ کے شمارے میں تزکیہ و تربیت کے باب میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا مکتوب شائع ہوا تھا مگر اس کے بعد مکتوبات شریف کی کسی شمارے میں زیارت نہیں ہوئی۔ براہ کرم اس سلسلے کو مسلسل جاری رکھیں۔ یہ دینی رہنمائی اور سنت کی پیروی کرنے کا ایک نہایت ہی مستند ذریعہ ہے۔

نواز علی نظامانی ' بدین

ہمارے ذہن میں جو کچھ طلب ہوتی ہے' وہ سب ترجمان القرآن میں موجود ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی نایاب جریدہ ہے۔ "تربیت کیسے کریں" سے تربیت کا راستہ عملی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ "ایک ہی راستہ: جدوجہد" سے بہت سے حقائق سامنے آئے۔

محمد تنظیم یٰسین ' ڈھیرکوٹ

"ایک ہی راستہ: جدوجہد" بے حد پسند آیا۔ اس دور کے نشیب و فراز سے آگاہی دیتا ہے۔

انجینئر ب۔ ک۔ جواد ' کویت

ماء واحد (نومبر ۹۶' ص ۱۳) کے معنی عربی قواعد کی رو سے "کوئی سا پانی" ہو جاتے ہیں۔ "ایک ہی پانی" کے لیے **الماء الواحد** آنا چاہیے۔ سورۃ الرعد میں ماقبل حرف جر ب کی وجہ سے زیر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے خیر خواہ بھائی کو جزائے خیر دے جو دلوں کو پگھلانے والے انداز میں **نصیحۃ من قرآن** کا انتخاب کرتا ہے۔

غازی الدین احمد ' کراچی

دل چاہتا ہے کہ ترجمان میں کوئی غلطی نہ ہو۔ ایک بھی گراں گزرتی ہے مثلاً اتفاق کے بجائے نفاق۔ توجہ اس لیے دلاتا ہوں کہ یہ خوب سے خوب تر ہو۔ عربی کے ایک شعر کا مفہوم ہے کہ آدمی کی شرافت کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کے عیب گنتی میں آ جائیں۔



دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی صحّت کے لیے انتہائی مؤثّر نباتاتی

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

اچھی صحت کا دارومدار صحت، ند دانتوں پر ہے۔ اگر دانت خراب ہوں یا عدم توجہی کے باعث گر جائیں تو انسان دُنیا کی بہت سی نعمتوں اور لذتوں سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ زمانۂ قدیم سے صحتِ دندان کے لیے انسان درختوں کی شاخیں بطور مسواک استعمال کرتا آیا ہے۔ ہمدرد نے تحقیق و تجربات کے بعد دارچینی، لونگ، الائچی اور صحتِ دہن کے لیے دیگر مفید نباتات کے اضافے کے ساتھ "مسواک ٹوتھ پیسٹ" تیار کیا ہے جو دانتوں کو صاف اور سفید رکھنے کے ساتھ مسوڑھوں کو بھی مضبوط، صحت مند اور محفوظ رکھتا ہے۔

سارے گھر کا ٹوتھ پیسٹ

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

مسواک کے قدرتی خواص صحتِ دنداں کی مضبوط اَساس

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ

Adarts HMPT-22/95

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ مجھے ان لوگوں میں سے بنا دے جو نیکی کریں تو خوشی محسوس کریں اور برائی کر گزریں تو استغفار کریں"۔

(مشکوٰۃ المصابیح)

منشورات

۱۹۹۷ء کا اشاعتی پروگرام

ان شاء اللہ محترم خرم مراد کی درج ذیل تحریریں کتابی شکل میں پیش کی جائیں گی۔

۱- **حج وداع** 8 ترجمان میں شائع شدہ، جس پر انھوں نے نظرثانی کی اور پروف خوانی بھی کر چکے تھے۔

۲- **اپنی تربیت کیسے کی جائے؟** 8 زیر تحریر کتاب، تین ابواب لکھا

۳- **کلامِ نبوی ﷺ کی صحبت میں** 8 ۱۹۹۶ء کے اسباق شامل کر کے مکمل

۴- **اشارات** 8 ملی قومی اور دینی مسائل کے حوالے سے تین مجموعے

۵- **رسائل و مسائل** 8 ترجمان القرآن میں شائع شدہ اہم مسائل کے جوابات

۶- **احمد کے نام** 8 بھارت کی قید سے نوجوان بیٹے کے نام ایمان کے تقاضوں سے آگاہ کرنے کے لیے سلسلہ وار خطوط

۷- **تصاویر قرآنی** 8 : سید قطب کی التصویر الفنی فی القرآن کا جو حصہ نظرثانی شدہ ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے

۸- **جنگی قیدی کے خطوط** 8 بھارتی قید سے لکھے گئے خطوط۔ (نیا ایڈیشن زیر طبع)

۹- **لمعاتِ زندان** 8 ڈھاکہ میں قید کے دوران اہلیہ کے نام لکھے گئے خطوط۔ (نیا ایڈیشن زیر طبع)

۱۰- **یاد داشتیں** 8 آخری دنوں میں ابتدائے حیات سے ۱۹۷۰ء تک کے حالات کیسٹوں میں ریکارڈ کروائے تھے، انہیں تحریری شکل میں پیش کیا جائے گا۔

۱۱- **مکاتیب** 8 قابلِ اشاعت مکاتیب کی غیر معمولی تعداد ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت شائع کیے جائیں گے۔

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

ہماری مطبوعات

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی اعلیٰ ایڈیشن	300 روپے
ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی ستا ایڈیشن	250 روپے
تفہیم القرآن جلد اول (سورہ الفاتحہ تا سورہ الانعام)	225 روپے
تفہیم القرآن جلد دوم (سورہ الاعراف تا سورہ بنی اسرائیل)	250 روپے
تفہیم القرآن جلد سوم (سورہ الکہف تا سورہ الروم)	250 روپے
تفہیم القرآن جلد چہارم (سورہ لقمان تا سورہ الاحقاف)	250 روپے
تفہیم القرآن جلد پنجم (سورہ محمد تا سورہ الطلاق)	225 روپے
تفہیم القرآن جلد ششم (سورہ التحریم تا سورہ الناس)	225 روپے
تفہیم القرآن ڈیلکس سیٹ	1800 روپے
تفہیم القرآن سپیشل سیٹ	1200 روپے
فہم القرآن	18 روپے
فہم القرآن (پارہ اول)	25 روپے
تفسیر سورۃ الفاتحہ والبقرہ	45 روپے
تفسیر سورۃ آل عمران	28 روپے
تفسیر سورۃ النساء	35 روپے
تفسیر سورۃ المائدہ	28 روپے
تفسیر سورۃ الاعراف	30 روپے
تفسیر سورۃ التوبہ	28 روپے
تفسیر سورۃ یونس	21 روپے
تفسیر سورۃ یوسف	13 روپے
تفسیر سورۃ المومنون	16/50 روپے
تفسیر سورۃ النحل	26 روپے
تفسیر سورۃ بنی اسرائیل	28 روپے
تفسیر سورۃ الانبیاء	18 روپے
تفسیر سورۃ الحج	28 روپے
تفسیر سورۃ النور	40 روپے
تفسیر سورۃ الفرقان	18 روپے
تفسیر سورۃ العنکبوت	18 روپے
تفسیر سورۃ لقمان	10 روپے
تفسیر سورۃ الاحزاب	30 روپے
تفسیر سورۃ یٰسین	12 روپے
تفسیر سورۃ الزمر	20 روپے
تفسیر سورۃ الفتح	18 روپے
تفسیر سورۃ الحجرات	18 روپے
تفسیر سورۃ الرحمٰن	12 روپے
تفسیر سورۃ الواقعہ	10 روپے
تفسیر سورۃ الحدید	21 روپے
تفسیر سورۃ المنافقون	10 روپے
تفسیر سورۃ التحریم	10 روپے
تفسیر تیسویں پارہ	60 روپے
سیرت سرور عالمؐ (جلد اول)	150 روپے
سیرت سرور عالمؐ (جلد دوم)	150 روپے
خطبات حصہ اول (حقیقت اسلام)	24 روپے
خطبات حصہ دوم (حقیقت صوم و صلوٰۃ)	15 روپے
خطبات حصہ سوم (حقیقت زکوٰۃ)	6 روپے
خطبات حصہ چہارم (حقیقت حج)	10/50 روپے
خطبات حصہ پنجم (حقیقت جہاد)	6 روپے
حقوق الزوجین	30 روپے
الجہاد فی الاسلام	125 روپے
خلافت و ملوکیت	90 روپے
سلاجقہ	28 روپے
دکن کی سیاسی تاریخ	28 روپے

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: نعیم صدیقی۔ عبدالوکیل علوی

یہودیت قرآن کی روشنی میں	84 روپے
نصرانیت قرآن کی روشنی میں	75 روپے

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: سید اسعد گیلانی

حکمت تبلیغ	80 روپے
دعوت و تنظیم	30 روپے

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: اختر حجازی

قوموں کے عروج و زوال پر ملی	
تحقیقات کے اثرات	36 روپے
استفسارات حصہ اول	75 روپے
استفسارات حصہ دوم	76 روپے
تفہیمات حصہ چہارم	60 روپے
خطبات یورپ مجلد	90 روپے
خطبات یورپ نمبر	27 روپے
دار الاسلام	125 روپے

عبدالکریم عابد

مولانا مودودی کے سیاسی افکار	24 روپے

سید قطب شہیدؒ

معرکہ اسلام اور سرمایہ داری	24 روپے

مولانا حیدر زمان صدیقیؒ

اسلامی نظریہ اجتماع	34 روپے
اسلام کا نظریہ جہاد	24 روپے
تعمیری انقلاب اور قرآنی اصول حکمت	24 روپے
عہد نبوت کے مسائل اور عصر حاضر	5 روپے

مولانا جلیل احسن ندویؒ

سفینہ نجات	75 روپے

سید اسعد گیلانی

رسول اکرمؐ کی حکمت انقلاب (مجلد)	120 روپے
مشاہدات حرمین	24 روپے
قرآن، رمضان اور محرم	21 روپے
اسلام اور مسلم خواتین	30 روپے
خطبات انبیاء	24 روپے
تحریک اسلامی کی پہلی کتاب	35 روپے
تحریک اسلامی کی دوسری کتاب	40 روپے
تحریک اسلامی کے مراحل	10 روپے
تحریک اسلامی کا تعارف	1 روپیہ
اسلام اور سوشلزم	46 روپے
دوش بدوش	46 روپے
اسلامی نظریہ ادب	30 روپے
امت مسلمہ سے خطاب	7/50 روپے

ام فاروق

رسول اکرمؐ	48 روپے

شبیر احمد منظر قدوسی

اقامت دین کا کام کہاں اور کیسے ہو؟	5 روپے

اختر حجازی

انسانیت کی موجودہ مشکلات اور سیرت رسولؐ	13/50 روپے

ڈاکٹر محمد امین

عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون	60 روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

رحمٰن مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون:- 7236652-7234014 پوسٹ کوڈ 54000

O.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE.

